رابندر ناتھ ٹیگور
اموش حُسن

خاموش حسن

رابندر ناتھ ٹیگور

KHAMOSH HUSAN

BY

RABINDER NATH TEGORE

PRICE Rs.35/-

YEAR OF PUBLICATION 1995

ناشر

پرنس بک ڈپو

نیو روہتک روڈ، نزد لبرٹی سینما، قرول باغ

نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵

انارکلی

(۱)

اکبر کے ایوان شاہی میں ایک باندی کی لڑکی نادرہ "انارکلی" کے نام سے مشہور تھی۔ ایک مرتبہ شہنشاہ نے ہنسی میں اس کو اس نام سے پکارا تھا۔ اس وقت سے اس کا یہی نام پڑ گیا۔

انارکلی ایک نہایت حسین اور پیاری لڑکی تھی۔ انار کی کلی کی مانند خوبصورت اور نازک۔ قصر شاہی کی مستورات میں وہ بہت زیادہ ہر دلعزیز تھی۔ شاہی محل کے محدود میدان میں وہ اس طرح ہنسی کھیلتی اور دوڑتی پھرا کرتی تھی۔ جس طرح بشاش اور خوش و خرم تتلی پھولوں کے کنج میں۔

مگر کلی کب تک بند رہ سکتی ہے؟ آفتاب کی سنہری شعاعیں آہستہ آہستہ اس کی خوبصورتی اور دلکشی چاروں طرف پھیلا دیتی ہیں۔ بعینہٖ یہی حالت انارکلی کی تھی۔

جوانی کی آمد نے اس کی خوبصورتی میں ایک کیفیت پیدا کر دی۔ وہ جو بیشتر دوشیزہ تھی۔ نازنین کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ کیسی حیرت انگیز تبدیلی اس کے بچپن کے کھیل کود کا وقت گزر چکا تھا۔ اب اس کی سادہ مسکراہٹ میں ایک

حیرت انگیز جادو تھا. اس کی کالی چمکدار آنکھوں میں ایک دل پذیر خوبصورتی تھی. جوانی کا جوش اس کو ہوا پر اڑائے لئے پھرتا تھا. ہر لحظہ نئی ادا دیکھنے میں آتی تھی۔

شاہی محل کی بیگمات انار کلی کو دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتی تھیں. اس کو دیکھ کر انہیں اپنے شباب کی یاد آ جاتی. جب اس کی سہیلیاں اسے چھیڑتیں اور کہتیں "آہا اب تو کلی کھلنے لگی" تو وہ ادا سے مسکرا کر جواب دیتی. "کیوں نہ کھلے گی"

رفتہ رفتہ وہ بے خبر لڑکی بے مثال حسینہ ہو گئی تھی. شاہی محل میں کسی قسم کا پردہ نہ تھا. انار کلی جادو بھری خوبصورتی پر سب سے پہلے جس کی نگاہ پڑی وہ شہنشاہ اکبر کا فرزند اور ولی عہد سلطنت تھا جہانگیر تھا۔

(۲)

انار کلی کی ادائیں ایسی دلفریب تھیں کہ ایک نظر دیکھ لینا اس کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دینے کے برابر تھا. اس کی خوبصورتی نے سلیم کے قلب نازک کو اپنے بس میں کر لیا. اور وہ اپنے دلی ارادے کے اظہار کے لئے کسی مناسب موقع کی انتظار کرنے لگا۔

ایک روز شام کا وقت تھا. بارش کی جھڑی لگ کر کھل گئی تھی. باغ کی کیاریاں مینہ کے پانی سے دھل کر صاف ہو گئی تھیں. موتیا کے تازہ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو باد نسیم کے ساتھ مل کر نئی کیفیت پیدا کر رہی تھی. جھینگوں سے بارش کی بوندوں کے ٹپ ٹپ گرنے سے دلکش راگ کی آواز پیدا ہوتی. آسمان صاف ہو رہا تھا. اور چاندنی درختوں کی آڑ میں چھن چھن کر نکل رہی تھی. انار کلی سبزہ پر خوش ہوا اپنے پالتو ہرنی کے بچے کی تلاش میں آہستہ آہستہ ٹہل

رہی تھی ——— "آرا! آرا!!"

یہ الفاظ اس نے بچے کو پکارنے کے لئے اپنی بہترین آواز میں کہے۔ جواب میں سونے کے گھونگھروؤں کی ہلکی آواز سنائی دی۔

"آرا! آرا!!"

پھر وہی جھنکار سنائی دینے لگی۔ لیکن وہ بہت دبی ہوئی تھی۔ کبھی بہت دور سنائی دیتی اور کبھی بہت نزدیک۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہرن کے بچے نے ضرور اس کی آواز سن لی ہے۔ ورنہ وہ اس کی آواز کا جواب کیونکر دے سکتا تھا۔ لیکن وہ کہاں تھا؟ اگر وہ آزاد ہوتا تو ایک ہی آواز کے ساتھ خوشی سے چوکڑیاں بھرتا اس کے پاس پہنچ جاتا۔ انارکلی نے پھر پکارنا شروع کیا۔ پھر وہی جھنکار کانوں میں آئی۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اور وہ اس کی طرف کو چل دی جہاں سے آواز آرہی تھی ——— رفتہ رفتہ وہ اس باغ کے ایک سنسان گوشے میں پہنچ گئی۔ اور تھکی ہوئی آواز سے پکارنے لگی۔

"آرا! تو ہے کہاں؟"

اتنے میں ہرنی کا بچہ ایک درخت کے پیچھے سے چھلانگیں مارتا ہوا نکلا۔ اور خوشی سے چوکڑیاں بھرتا انارکلی کے پاس آپہنچا۔ شام کی خاموشی میں اس کے گلے اور پاؤں میں پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھونگھروؤں کی جھنکار سے وہ سماں اور بھی سہانا ہو رہا تھا۔ انارکلی اس کو چمکا کر پیار کرنے لگی اور اپنے نازک ہاتھ اس کی گردن میں ڈال کر بولی۔

"تو اب تک کہاں تھا؟ تجھے کس نے پکڑ رکھا تھا؟

"میں نے"

انار کلی خوفزدہ ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پیچھے سے ایک نوجوان آہستگی سے مسکراتا ہوا نکلا

"میں نے ہی تمہارے ہرن کو پکڑ رکھا تھا۔"

انار کلی کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی۔ فرطِ حجاب سے اس کے رخسار گلابی ہوگئے۔ اس نے چہرے کو گھونگھٹ میں چھپا لیا۔ اور جھک کر سلام کیا۔ "میں معافی کی خواستگار ہوں۔" انار کلی نے گڑگڑاتی ہوئی آواز سے کہا "مجھے معلوم نہ تھا کہ ......"

بات پوری نہ ہونے پائی تھی کہ سلیم مسکراتا ہوا بولا "نہیں الٹا مجھے چاہیئے کہ تم سے معافی مانگو۔ میں نے تمہارے ہرن کو روک کر اتنی دیر تم کو تنگ کیا تم جانتی ہو کہ میں نے اُسے کس لیئے روک رکھا تھا؟" پھر خود ہی مسکراتے ہوتے آگے بڑھ کر جواب دیا "صرف اس لئے کہ اس کی آنکھیں بھی تمہاری آنکھوں کی مانند ہیں۔"

انار کلی چپ چاپ کھڑی سنتی رہی۔ اس نے پہلے بھی سن رکھا تھا کہ شہزادہ اس پر نظر رکھتا ہے۔ اب سلیم کے لفظوں نے شک کے سارے امکانات رفع کر دیئے۔

انار کلی ایک نامعلوم خوشی کے باعث چپ تھی۔ سلیم اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ انار کلی نے نگاہ اوپر اٹھا کر سلیم کو دیکھا۔ دونوں آنکھیں چار ہوئیں۔ سلیم مسکراتا ہوا للچائی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کی مسکراہٹ نے انار کلی کے ہونٹوں پر بھی حجاب آمیز تبسم کی لہر پیدا کر دی۔
سلیم نے آہستگی سے اپنے ہاتھ انار کلی کی گردن میں ڈال دیئے اور اس کو اپنی
طرف کھینچا۔

اس کے ساتھ جوش سے بول اٹھا "انار کلی تو میری اور فقط میری ہے۔"

دونوں کے جسم آہستگی سے ایک دوسرے سے ملے۔ انار کلی کچھ لڑکھڑائی۔ سلیم
کی باہیں اس کے گلے میں پڑی تھیں۔ وہ ایک طرف کو کھسک گئی۔

ہرنی کا بچہ اچانک چونک پڑا۔ گویا کسی بڑے خواب سے بیدار ہوا ہو جیسے
ہی اس نے اوپر کی طرف نگاہ کی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی
دو بوندیں چاند کی شفاف چاندنی میں موتیوں کی مانند چمکتی نظر آئیں۔

(۳)

اس رات انار کلی سو نہ سکی۔ اس کا بخت یاور تھا اور خوشی بھی نیند کو دور
کرنے میں اضطراب سے کم موثر نہیں ہوتی۔ سلیم کے اس عجیب اور فوری اظہار
محبت نے مسرت کی ناقابل بیان لہر اس کے جسم میں موجزن کر دی۔ وہ بحرِ تخیل
میں غوطہ زن حیرت انگیز مسرت کے ارمانوں سے بھرپور تھی۔

آنکھیں بند کئے وہ اپنے بستر پر پڑی جاگ رہی تھی۔ اس وقت اس کے
ذہن میں صرف گزشتہ واقعات کے خیالات تھے۔ وہ شام کے واقعہ کی چھوٹی
سے چھوٹی تفصیل پر از سر نو غور کر رہی تھی۔

سلیم نے اُسے کس طرح پکارا تھا۔ اس کی زبان میں کتنی شیرینی تھی۔ اس نے
اپنے چہرے پر سرخی کا دوڑ جانا کس طرح محسوس کیا تھا۔ سلیم کے بوسہ لے لیا

اور بغلگیر ہونے سے وہ کس طرح لڑکھڑا کر ہٹ گئی تھی۔ دونوں کی آنکھیں کس طرح چار ہوئی تھیں۔ سلیم کی آنکھیں کتنی للچائی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے کیسے انکساری اور عاجزی سے لبریز معانی کا اظہار ہوتا تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ آہ وہ پُرلطف گھڑی! جب دونوں کے ہونٹ بے خبری میں خود بخود مل گئے۔ اس کے نازک رخسار گلاب کی پنکھڑیوں کی مانند معلوم ہوتے تھے ہمیں جمال تھا۔ جو اس کے جسم میں پوشیدہ کام کر رہا تھا۔ وہ بار بار محسوس کرتی تھی کہ اس کا دل دھڑک رہا ہے پھر وہی پُرمسرت فتح کا خیال آجاتا۔

ان خیالات نے اس کے دماغ میں ہیجان برپا کر رکھا تھا۔ وہ کیسے سو سکتی تھی۔ "محبت! ہاں یہی اور صرف یہی"

شہزادے نے اس سے اظہار محبت کیا۔ کیسی حیرت انگیز بات تھی؟ وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکی کہ یہ واقعہ کس طرح ہوا؟

کیا وہ درحقیقت خوبصورت تھی۔ ہاں! اس کو یقین ہو گیا کہ وہ درحقیقت حسین ہے۔ اس مسرت آمیز خیال اور اس حسن کے ناز نے اُسے دیوانہ بنا دیا۔

محبت اور عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنا کیا دل لبھانے والا خیال تھا ایک لمحہ کیلئے مستقبل کی پُرلطف زندگی کا تصور اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

سلیم اُسے اپنے دل کی ملکہ بنائیگا۔ اور یہ محبت کا جادو دونوں کو عیش و عشرت کی طرف لے جانے لگا۔

"اے مبارک گھڑی خدا کے لئے جلد آ!"

اس طرح انار کلی بحر تخیل میں غوطے کھا رہی تھی۔ اُس کے سینہ میں خوشی

کا طوفان امڈ آیا۔ اور اس نے اس کے دماغ کا محاصرہ کر لیا۔

وہ انہی باتوں پر بار بار غور کر رہی تھی۔ اور ہر بار لطف محسوس کرتی۔ مارے خوشی کے وہ آپے سے باہر ہوئی جاتی تھی۔

سلیم نے بھی اسی طرح بے تابی سے رات بسر کی۔ ابھی اس کی اٹھتی جوانی تھی اس کے سن بلوغت میں قدم رکھا ہی تھا مگر اس سے زیادہ اور کون محبت کر سکتا ہے۔ جس کے دل میں بھولے پن کے ساتھ جوانی کا جوش بھی ہو۔ اسی عمر کی پاکیزہ محبت عجیب پُر تاثیر ہوتی ہے۔ محبت کی راہ میں قدم رکھنے کا سلیم کے لئے یہ پہلا ہی موقعہ تھا۔ صرف انارکلی ہی سے دوچار ہوا تھا۔ اس سے پیشتر اس کا دل کسی اور پر نہ آیا تھا۔

سلیم انارکلی کی خوبصورت آنکھوں کی دلکش طاقت۔ شیریں گفتار سرخ رخساروں اور اس کے ساتھ اپنی محبت کے تصور میں غرق تھا۔ اسی محبت کی حالت میں وہ بے تابی کی نیند سو گیا۔

(۴)

کچھ ہی دنوں کے بعد دربار شاہی میں عیش و عشرت کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ شہنشاہ اکبر چونکہ سنگیت ودیا کا شوقین تھا۔ اکثر شام کے وقت راگ سن کر دل خوش کیا کرتا تھا۔ گانے اور ناچنے میں انارکلی بہت ماہر تھی۔ اسی باعث وہ اکبر کی نظروں میں بس گئی تھی۔ گانے بجانے کا کوئی جلسہ اس کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا تھا۔ جب اکبر شام کا وقت شاہی محل کی بیگمات میں بسر کرتا تو انارکلی کو اس کے سامنے ناچنا اور گانا پڑتا تھا۔ آج شیش محل چمکتی ہوئی رنگ برنگی

قندیلوں کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ لاکھوں آئینوں پر اس کا عکس پڑنے سے محل جڑاؤ زیوروں کی طرح چمکتا تھا۔ کمخواب کا فرش بچھا ہوا تھا جس پر اکبر جلوہ افروز تھا بیگمات مکلّف غالیچوں پر لگی ہوئی پرآرائش مسندوں پر بیٹھی تھیں۔

راگ رنگ شروع ہوا تھا۔ کئی گانے والیوں کا گانا ختم بھی ہو گیا تھا۔ مگر انارکلی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کے گانے کی باری تھی۔ وہ ادا کے ساتھ اٹھلاتی ہوئی حاضر ہوئی۔ شہنشاہ کی تعظیم کیلئے جھکی اور چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔

آج انارکلی گلابی رنگ کا زردوزی لباس زیب تن کئے تھی۔ بال بال موتی پروئے ہوئے۔ صراحی کی مانند گردن اور ابھری ہوئی چھاتی پر موتی ہی موتی جھلک رہے تھے آج تک کسی نے اس کو ایسے زرق برق لباس میں ادا کے ساتھ نہ دیکھا تھا۔ اگرچہ اس کی خوبصورتی کو کسی قسم کے زیورات کی حاجت نہ تھی تاہم اس شام کو جواہرات اور بھڑکیلے کپڑوں نے اس کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

اکبر نے آنکھ اٹھا کر انارکلی کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ اس نے کہا۔

"ماہ منیر کو چھوٹے چھوٹے چمکدار ستاروں پر فتح حاصل کرنے کے لئے ہالے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تو پھر اے خوبصورت لڑکی! یہ زرق برق لباس کس لئے؟"

انارکلی کے چہرہ پر شرم کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ وہ ان سب باتوں کو جو اس کے دل میں پنہاں تھیں کس طرح ظاہر کر سکتی تھی۔

سلیم وہاں موجود تھا پھر کیونکر وہ اچھے سے اچھا لباس زیب تن کر کے نہ آتی۔

سارنگی کے دھیمے سروں نے محل میں سماں باندھ رکھا تھا۔ انارکلی کھڑی سن رہی تھی۔ اس نے بجانے والوں کی طرف سر ہلا کر خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا ـــــ اور

خود آئے بڑھ کر اپنے داہنے پاؤں کی گت دی۔ سونے کے پازیب کی نازک جھنکار نے
اس خاموشی میں ایک لہر پیدا کر دی۔ آہستگی سے اس نے پاؤں کو دوبارہ گت دی
پھر وہی چھم چھم کی خوش آہنگ آواز پیدا ہوئی۔ سارنگی کے سر میں بھی لے آگئی۔
اس نے بہت دھیمے اور باریک راگ میں گانا شروع کیا۔ اس کی سریلی آواز پائجوں
کی آواز میں مل گئی۔ انار کلی کی آواز کبھی کبھی اتنی دھیمی ہو جاتی تھی کہ صرف اس کے
ہلتے ہوئے ہونٹوں ہی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ گا رہی ہے۔ رفتہ رفتہ آواز صاف
ہوتی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شیریں منقار پرندہ چاندنی رات میں مسرت
کر دینے والا راگ الاپ رہا ہے۔

اس شام گاتے وقت انارکلی کے دل میں ایک پوشیدہ لطف کا خیال لہریں لے
رہا تھا۔ اس کو معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے در اصل یہ صرف
محبت ہی تھی جو اس کی نس نس میں جاگزیں تھی۔

اس نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی۔

سلیم سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس
کی بڑی بڑی آنکھوں سے چاہت ٹپکی پڑتی تھی خفیہ ملاقاتوں کی یاد انارکلی کے دل
میں تازہ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں اور زبان سے بے پایاں مسرت کا اظہار ہونے لگا اور
سلیم! اس کی آنکھوں میں انارکلی کی خوبصورتی کی تصویر تھی۔ سوچنے لگا۔ انارکلی میں
کیسی خوبصورتی اور محبت بھری ہوئی ہے۔ انارکلی پھر گانے لگی ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

راگنی کے الفاظ انار کلی کے کسی ایسے ارادے کو ظاہر کرتے تھے جس کو اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ بحر محبت میں غوطہ زن ہوتے ہوئے اپنے عاشق کے سامنے گانا اور پھر ان راگنیوں کا گانا جن کے خیالات اس کے دل میں سمائے ہوئے تھے۔ وہ سب کچھ بھول گئی۔ اس کو اتنا بھی خیال نہ رہا کہ وہ شہنشاہ کے سامنے گا رہی ہے۔ اس کو صرف ایک بات کا علم تھا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ صرف دو ہی شخص موجود ہیں۔ ایک وہ خود اور دوسرا اس کا عاشق۔ وہ ناچ گا رہی تھی۔ مگر آنکھیں سلیم ہی کی آنکھوں سے ملتی تھیں۔ اس کی آنکھوں کا اظہار محبت اس کے حسن میں چار چاند لگا رہا تھا۔ اسی وقت ایک بلند آواز سنائی دی یہ اکبر کی آواز تھی۔ جس نے گانا بجانا سب بند کرا دیا۔ چاروں طرف خوف اور خاموشی چھا گئی۔

اکبر یکایک غصہ میں آ گیا۔ اس کی بھویں تن گئیں غصے کے مارے آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ وہ کب سے آئینے کے عکس میں پُرجوش محبت کے ان پیغاموں کو جو سلیم کی طرف سے انارکلی اور انارکلی کی طرف سے سلیم کے پاس آ جا رہے تھے۔ دیکھ رہا تھا۔ اور آئینے میں دونوں کے خیالات پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ دونوں کا آنکھیں لڑانا اتنا پُر معنی تھا کہ اکبر پر ان کے دلی خیالات کامل طور پر ظاہر ہو رہے تھے۔ اس میں شک نہیں دونوں میں ایک طرح کا گہرا تعلق تھا۔ جس سے اکبر اب تک ناواقف تھا وہ لگاتار غور کے ساتھ دونوں کو تاڑ رہا تھا ہر ایک نگاہ کا وار اس کے شک کو بڑھا رہا تھا جیسا اس نے انار کلی کو مسکراتے دیکھا اور مسکراہٹ کا جواب سلیم کی طرف سے بھی دیا گیا۔ تو اس کو کامل

یقین ہوگیا کہ انارکلی سلیم کو اپنے دامِ حسن میں پھانسنے کی کوشش کر رہی ہے

ہر چند اکبر کے مزاج میں غضبیت نہ تھی۔ اور وہ بڑا متحمل اور منکسر المزاج تھا تاہم اس وقت وہ بھی غصے میں آپے سے باہر ہوگیا۔ سلیم اس کا بیٹا اور ولی عہدِ سلطنت ایک باندی کی لڑکی سے محبت کرے۔ اُس نے بلند آواز میں خواجہ سراؤں کے داروغہ کو بلا کر اپنی انگلی کو جھٹکا دیتے ہوئے انارکلی کی طرف اشارہ کیا۔ اور کہا۔ اس لڑکی کو یہاں سے لے جاؤ اور حوالات میں بند کر دو۔ تاکہ ادنیٰ پیشہ کی عورتوں کو جو بغیر کسی موقع محل کے بناؤ سنگار کرتی ہیں خوف و عبرت ہو"

اکبر کے الفاظ کا فضا میں گونجنا تھا کہ تمام مجلس پر سناٹا چھا گیا۔

انارکلی اکبر کے چہرے کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ مگر جب اس نے اکبر کی انگلیاں اپنی طرف اٹھتی دیکھیں تو اس کے جسم میں خوف کی ایک لہر چل کر رہ گئی۔ شہنشاہ کے اس طرح کا حکم دینے کا کیا مطلب؟ اُس نے اپنے دل سے دریافت کیا۔ ساتھ ہی ایک خوفناک آواز سُنی۔ اس کا سر جھک گیا۔ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ جو کچھ بھی اس نے سنا تھا اُسے پورے طور پر نہ سمجھ سکی۔

اچانک اُسے معلوم ہوا کہ اس کے ہاتھ کو کسی نے چھُوا۔ یہ ایک خواجہ سرا تھا۔ جو اُس کو حوالات کی طرف لے جانے کی غرض سے آیا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے افسوس ٹپک رہا تھا۔ پاگلوں کی مانند اُس نے خواجہ سرا سے اپنے آپ کو چھڑایا اور زور سے چلّا کر اکبر کے قدموں پر گر پڑی۔

تاریکی اور سکوت۔ ایسی تاریکی جو کسی چراغ کے بجھ جانے سے بہت زیادہ پھیل جاتی ہے۔ ایسا سکوت جس میں پرندوں کے پر پھڑپھڑانے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ بے حد خوفناک نظارہ تھا۔ چراغ بجھ گیا۔ اور چاروں طرف سکوت تھا۔

اس سنسان تاریکی میں انار کلی کو ہوش آیا۔

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ اور پھر تخیل میں غرق ہو گئی اس کو ہر چیز تاریک دکھائی دیتی تھی، اچانک پھر وہی خون کو منجمد کرنے والی بادشاہ کے دماغ میں آئی۔ آہ! کیسے خوف کا سامنا تھا! ایک قیدی کی حیثیت میں، اجل کے مہمان کی صورت میں وہ پتھر کے فرش پر پڑی تھی۔

اس کا دل بیٹھ گیا۔ جب اس نے اس خوفناک موت کا خیال کیا جس سے صبح کو وہ بغلگیر ہونے والی تھی۔ صرف چند گھنٹے اور زندہ رہنے کے بعد اس کی پُر لطف زندگی ختم ہو جائے گی۔

موت۔ ہر چیز کا خاتمہ کر دینے والی موت۔ ہر لمحہ اس سے نزدیک ہوتی جاتی تھی۔ وہ مایوسی کی حالت میں ہاتھ مل رہی تھی۔ آہ! بے رحم ظالم موت! جس کے انتظار میں رہنا۔ اور آنے والے لمحوں کو شمار کرنا خود موت سے بڑھ کر تکلیف دہ ہے۔

انار کلی بیٹھی تھی۔ مگر سر میں چکر آرہے تھے۔ دفعتہً وہ ناہموار فرش پر کسی گھائل کے مانند سر کے بل گر پڑی۔ اور دلی رنج سے رونے لگی وہاں اسکو کوئی بچانے

والا نہ تھا۔ کوئی اس سے ہمدردی کرنے والا نہ تھا۔ کوئی اس کی ڈھارس بندھانے والا نہ تھا۔ سلیم جس کے لئے اس بیچاری کو ایسی خوفناک موت کا سامنا کرنا پڑا وہ کہاں تھا؟ سلیم کا خیال آتے ہی ایک ٹھنڈی آہ اس کے سینہ میں تھی۔ اور وہ اتنا روئی کہ اس سے زیادہ رونا ممکن نہ تھا۔ جب اس کی ہچکیاں بند ہوئیں اور ہوش بجا ہونے لگے تو اس نے صبر سے سوچنا شروع کیا۔ اس کا دل اس کو پھر انہی واقعات کی طرف لے چلا۔ جو اس کی موت کا باعث ہوئے تھے۔ وہ سوچنے لگی۔ اس نے ایسا کونسا کام کیا تھا۔ جس سے وہ اس کی ذمہ دار ٹھہرائی گئی۔ اس نے صرف شہزادے سے محبت کی۔ مگر کیا یہ کوئی بڑا کام ہے؟ کیا محبت کرنا گناہ ہے؟ اس کو اس بات کا یقین نہ آسکا کہ اس نے درحقیقت کوئی بڑا کام کیا ہے؟

اے خدا تو نے وہ محبت کیوں پیدا کی۔ جب کہ اس کا پایۂ تکمیل تک پہنچنا ہی نا ممکن تھا۔

کوئی چیز ایسی نہ تھی۔ جو اس کو تسکین دے سکتی۔ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اس کا خوف دور کر سکتی۔ اس کا دھیان پھر سلیم کی طرف گیا۔ کیا وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا؟ یکایک ایک اور خیال اس کے دل میں آیا۔ کیا درحقیقت شہزادہ کو اس سے محبت ہے؟ یا اس کی محبت معمولی خیال کے برابر تھی۔ جس کو انسان ہر دم بھولتا رہتا ہے۔ یہ خیال موت کے خیالات سے بھی زیادہ سوہان روح تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سلیم اسے سچے دل سے نہ چاہتا تھا۔ موت کے برابر کرو دا ہٹ تھی۔ اسی وقت اس نے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنی۔ دروازہ کھلا۔ اور ایک

سنتری کا ہاتھ میں مشعل لئے کوٹھڑی میں آیا۔ اس کے پیچھے ایک شخص بھی تھا
سلیم!

انارکلی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو سلیم کو اپنے پاس کھڑا پایا۔ اچانک اس کے
منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ ایک لمحہ کے بعد دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے
سنتری مشعل کو وہیں نزدیک کوٹھری میں کھڑی کر کے چلا گیا۔

انارکلی اور سلیم دونوں تنہائی میں روتے اور دلی رنج کے آنسو بہاتے رہے
بہت عرصہ کے بعد دونوں ٹھنڈے ہو کر بات چیت کرنے کے قابل ہوئے۔

سلیم نے آہستگی سے کہا "جان سے پیاری انارکلی میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔
میرے ساتھ چلو۔"

انارکلی غور سے سلیم کی طرف دیکھنے لگی۔ سلیم نے کہا "میں نے سواری کے لئے
دو گھوڑوں کا انتظام کر لیا ہے۔ صبح ہوتے ہی ہم کئی میل دور نکل جائیں گے
ہم اپنا بھیس بدل لیں گے کہ کوئی ہمیں پہچان نہ سکے گا۔"

انارکلی نے رنج آمیز آواز میں کہا "ضرور ہمارا تعاقب کیا جائیگا۔ اور ہم پکڑ لئے
جائیں گے۔ میرے لئے کیوں اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے ہو۔"

پیاری یہ ساتھی ایسے ہیں۔ جو ہمارا تعاقب کرنے والوں کو الٹا پتہ بتائیں گے
ہمارے گھوڑوں کے سموں پر ایسی چیزیں لپٹی ہوں گی کہ اگر ہم سرپٹ بھاگیں تو بھی
ان کی آواز سنائی نہ دے گی۔ میری اچھی انارکلی جلد چلو۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے
وقت کو فضول ضائع نہ کرو۔"

انارکلی شش و پنج میں پڑ گئی۔ سوچنے لگی کہ سلیم کی جان کو خطرہ میں ڈالنے

کا اسے کیا حق ہے۔

اس نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا: "پیارے سلیم! اس میں شک نہیں کہ میری موت آ گئی ہے اگر خدا اور شہنشاہ دونوں کی یہ خواہش ہے۔ تو میں کیسے زندہ رہ سکتی ہوں؟ میں اس تنگ کوٹھڑی کو ہرگز نہ چھوڑوں گی۔ جب تک کہ موت سے بغلگیر ہونے کے لئے یہاں سے نکالی نہ جاؤں۔"

سلیم نے تعجب سے کہا۔ "یہ کیا جنون ہے؟ میں تمہیں ایک ظالم اور بے رحم انسان کے ہاتھ سے خوفناک موت مرنے کے لئے ہرگز یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔"

سلیم نے انارکلی کو زبردستی لے جانے کے لئے اپنی طرف کھینچا۔ مگر اس نے زور سے اپنے آپ کو چھڑا لیا اور تھرائے ہوئے الفاظ کے ساتھ بولی: "پیارے میرے دن اب پورے ہو چکے۔ موت کے سامنے کسی کی پیش نہیں جاتی۔ اب زندہ رہنے کی کوشش فضول ہے۔ شہنشاہ کا ہر لفظ خدائی فرمان ہے۔ تم میرے ساتھ کیوں چلتے ہو۔ جب کہ اس بات کا کامل یقین ہے کہ ہمارا تعاقب ضرور کیا جائیگا۔ کیا تم نے ان سب باتوں کے بارے میں جو ہمارے پکڑے جانے کا باعث ہو سکتی ہیں۔ اچھی طرح سوچ لیا ہے؟"

سلیم نے پریشان ہو کر جواب دیا۔ "اس وقت میں ان باتوں کی تشریح نہیں کر سکتا۔ یہ وقت تشریح کرنے کا نہیں ہے۔ میرا باپ اگر سخت اور بے رحم ہے تو میں اس کے احکام کی تعمیل کرنا فرض نہیں سمجھتا۔ وہ ہمیشہ کے لئے [illegible] کا مالک نہیں رہ سکتا۔ میں کسی جلد یا بدیر اس کا مالک ہوں گا۔"

انارکلی چپ چاپ سلیم کی باتیں سنتی رہی۔ سلیم نہ سمجھ سکا کہ انارکلی کے اس انکار کا کیا سبب ہے۔ وہ کس لئے قید خانہ سے رہا ہونے کے لئے تیار نہیں۔ اور اس طرح موت کی راہ تک رہی ہے۔

یہ دیکھ کر کہ قیمتی وقت اس طرح بے فائدہ ضائع ہو رہا ہے۔ سلیم نے اسے تاریک قید خانہ چھوڑنے اور ساتھ چلنے کی بار بار التجا کی۔ لیکن انارکلی یہ سمجھ کر کہ شہنشاہ کی ناراضگی سلیم کی جان کو خطرہ میں ڈالنے والی ہے۔ ہر دفعہ انکار ہی کرتی رہی۔

آخر سلیم سے نہ رہا گیا۔ وہ جوش میں آ کر بولا "انارکلی انکار کس لئے۔ تیرے بغیر میں کس طرح زندہ رہونگا۔ اگر تو مرنا چاہتی ہے۔ تو میں بھی مرنے کے لئے تیار ہوں۔ تو جب تک میرے ساتھ نہ چلے گی۔ میں ہرگز یہاں سے نہ نکلوں گا"

انارکلی کے خیالات میں یکایک تبدیلی آ گئی۔ وہ گھبرا کر بول اٹھی "تو کیا ابھی بہت وقت نہیں گذرا۔ کیا اب بھی ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں" سلیم نے اس کو یقین دلایا کہ کسی قسم کا خوف نہیں ہے۔ اب بھی وقت ہے۔

اس وقت زور سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی اور فوراً دروازہ کھل گیا۔ ایک شخص بلدی سے اس کوٹھری میں داخل ہوا اور چڑھے ہوئے سانس کو روک کر جلد جلد کہنے لگا۔ "حضور والا بادشاہ سلامت اسی راہ سے آ رہے ہیں" سلیم فکرمند ہو کر بولا "اب کیا ہو گا؟"

نوارد نے جواب دیا "آپ وقت ضائع نہ کریں اور اسی وقت اس کوٹھری کو چھوڑ دیں۔ جب بادشاہ سلامت لوٹ جائیں تو آپ پھر آ سکتے ہیں"

سلیم نے اس سے کہا۔" باہر ٹھہرو۔ رحیم خاں میں، ابھی آتا ہوں "۔ یہ کہہ کر اس نے ایک محافظ کا لباس جس کو وہ آتے وقت اپنے ساتھ لیتا آیا تھا پہن لیا۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد اس نے انار کلی کو سینے کے ساتھ لپٹا کر کہا "پیاری میں، تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں تیار رہنا"۔

انار کلی نے مایوسانہ سلیم کی طرف دیکھا۔ مگر ایک لفظ بھی زبان سے نہ کہہ سکی۔

سلیم نے اس کے سر کو اوپر کی طرف اٹھایا اور جھک کر ایک بوسہ دیا۔ اس کے بعد چراغ بجھا کر وہاں سے چل دیا۔

انار کلی اپنی جگہ سے نہ ہل سکی اور نہ کوئی لفظ اس کی زبان سے نکل سکا۔ وہ بوسہ کا جواب تک نہ دے سکی۔

سلیم کے چلے جانے کے بعد اس نے اپنے بچ جانے کی امید کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ تاریکی نے پھر وہی تنہائی اور ناامیدی کا خوفناک نظارہ پیش کر دیا۔

(٦)

کوئی بھی نہ آیا۔ رحیم خاں نے جھوٹ ہی کہہ دیا تھا۔ نہ بادشاہ سلامت نہ کوئی دوسرا آدمی انار کلی کے حجرہ تاریک کی طرف آ رہا تھا۔

شہزادہ سلیم نے اپنا ایک الگ گروہ تیار کر رکھا تھا۔ اسکی آزاد طبیعت نے اس کے دل میں اپنے باپ کی زندگی میں ہی آزادی یا حکومت حاصل کرنے کا خیال پیدا کر دیا تھا۔ زنانہ محل کے چھوٹے سے قید خانے کا داروغہ رحیم خاں بھی سلیم کے معتقدوں میں سے تھا۔ اسی کی مدد سے سلیم اس رات کو قید خانہ میں انار کلی

سے مل سکا تھا۔ رحیم خاں یہی سمجھ ہوئے تھے کہ شہزادہ صرف انار کلی سے آخری ملاقات کرنے کے لئے آیا ہے اس کو اس بات کا پتہ نہ تھا کہ وہ انارکلی کے ساتھ بھاگنے کی تیاری میں مصروف ہے۔

جس وقت سلیم انار کلی کے پاس آیا تو رحیم خاں دروازہ کے باہر ان دونوں کی ہنسی مذاق کی باتیں سن رہا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ شہزادہ اس کے زیرِ نگرانی قیدی کو یہاں سے نکال لینا چاہتا ہے۔ تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر بادشاہ سلامت کو اس بات کا پتہ چل گیا۔ تو اس کی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ ساتھ ہی سلیم کو روکنا بھی مناسب نہ تھا کیونکہ یہ بات ہر شخص کو معلوم تھی کہ بادشاہ سلامت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اور اُن کے تختِ شاہی پر ایک نہ ایک دن سلیم ضرور بیٹھے گا۔ سانپ مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یہ خیال کرکے اس نے ایک طریقہ سوچا جس سے وہ سلیم کو ناراض کئے بغیر ہی وہاں سے رخصت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

جونہی سلیم اندر سے نکلا۔ رحیم خاں نے اس کو کچھ فاصلہ پر دو لالٹینیں دکھلائیں جو خود اس کے آدمیوں نے روشن کر رکھی تھیں مگر شہزادہ نے پھر ان کی طرف نگاہ تک نہ ڈالی۔ کیونکہ باپ کے خوف سے اس کی آنکھیں نمل گئیں۔ اُس کے حوصلہ نے اس حالت میں اس کا ساتھ نہ دیا۔ کہ اُس وقت وہ اپنے باپ کے سامنے ظاہر ہو کر کھلم کھلا اس کی مخالفت کر سکے۔

اسی حالت میں رحیم خاں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر شاہی محل کی گلیوں میں ہوتے ہوئے اس کے کمرے تک پہنچا دیا۔

کچھ دیر بعد سلیم نے پوچھا "کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ وہ بادشاہ سلامت ہی تھے ؟"

رحیم خاں نے یقین دلاتے ہوئے کہا "ہاں حضور !"

سلیم نے کم حوصلگی سے پوچھا "اُن کے یہاں آنے کا باعث ؟"

رحیم خاں بولا "حضور کو معلوم ہی ہوگا کہ عالم پناہ اکثر اوقات رات کے وقت اچانک یہاں آکر گشت کیا کرتے ہیں۔ آج بھی اُن کے یہاں آنے کا یہی سبب ہو سکتا ہے۔"

سلیم نے ہنس کر کہا "علی الصبح جب وہ یہاں آئیں گے تو ان کو معلوم ہو جائے گا۔"

کچھ لمحے گذر گئے۔ رحیم خاں کا فکر اور بھی بڑھ گیا کیونکہ شہزادہ کی باتوں سے اس کو یقین ہو گیا کہ وہ اب بھی انارکلی کو یہاں سے لے کر بھاگ جائے گا۔ اب کیا کرنا چاہیئے۔ اگر ایسا ہوا تو علی الصبح اس کی جان کی خیر نہیں۔ لیکن جلد ہی اس نے ایک سہل طریقہ سوچ لیا۔ اور اس کے سلسلہ میں عرض کیا۔

"حضور تھکان دور کرنے کے لئے شراب کے دو ایک پیالے پی لیں۔"

تھکان کے باعث سلیم کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے کہا "ہاں شیراز کی شراب کا پیالہ لاؤ۔"

رحیم خاں شراب لانے کے لئے پاس کے کمرہ میں چلا گیا۔ اس نے صراحی لے کر چپکے سے اپنے کمر بند سے ایک پڑیا نکالی۔ اور ایک سفید رنگ کا سفوف اس میں ملا دیا۔

سلیم اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جب رحیم خاں شراب لایا تو وہ ڈگڈگا کر پی گیا پھر دوسرا پیالہ مانگا۔ رحیم خاں نے دوسرا پیالہ بھی بھر دیا۔ جس کو شہزادہ بڑی تیزی سے پی گیا۔

کچھ دیر بعد سرور میں آکر بولا: "رحیم خاں مجھے انار کلی کے پاس لے چلو"

"میں تو حضور کی خدمت بجا لانے کے لئے حاضر ہوں مگر......"

"مگر کیا؟"

"بادشاہ سلامت اب تک دہیں ہوں گے"

"تو بھی ایک مرتبہ دیکھ تو لو"

"جیسا حکم"

رحیم خاں کورنش بجا لا کر وہاں سے چل دیا۔ وہ اس بات سے بےفکر تھا کہ دوا اپنا کام کر رہی ہے اور اب سلیم صبح تک نہیں اٹھ سکتا۔

(۷)

انار کلی سلیم کے واپس آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر وہ اب تک نہیں آیا۔ انار کلی کی بے تابی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ مگر اب بھی اس امید کی جھلک کچھ کچھ باقی تھی کہ شاید سلیم آجائے اور مجھ کو یہاں سے چھڑا لے جائے۔

صبح کی روشنی نے بڑی آہستگی سے اس کوٹھڑی کی تاریکی کو جس میں انار کلی قید تھی۔ دور کیا۔ ہلکی روشنی میں اس کو اپنے سامنے چمکتی ہوئی ایک چیز نظر آئی۔ جلد ہی اس کو یاد آگیا کہ یہ اس انگوٹھی کے ہیرے کی چمک ہے جو اس کی ماں نے مرتے وقت اسے دی تھی۔ انار کلی کی ماں نے یہ انگوٹھی اس کے ہاتھ میں

پہناتے ہوئے کہا تھا۔" تجھے کبھی اس کی ضرورت نہ پڑے گی۔ لیکن پھر بھی اگر اس دنیا میں تیرے لئے امید کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو اس کو چاٹ لینا۔"

انار کلی کو اپنی ماں کی وہ وصیت یاد آگئی۔ اُس نے فوراً انگوٹھی میں سے اس ہیرے کو منہ میں ڈال لیا۔ بچپن کے زمانہ اور اپنی ماں کے تصورات اس کے دماغ میں گھومنے لگے۔ اس کے بعد اُسے سلیم کی محبت کی رنجیدہ یاد پھر آگئی۔

انہی خیالات میں اس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ سر کو اپنے نازک ہاتھ کا تکیہ لگائے ٹھنڈے سخت ناہموار فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ہونٹ نیم باز تھے۔ آنکھیں کچھ کھلی اور کچھ بند تھیں۔

جب شاہی ملازم بادشاہ سلامت کی طرف سے موت کا پیغام لے کر آئے اور ایک لمحہ کچھ سوچنے کے بعد دروازہ کھول دیا تو صبح کے آفتاب کی شعاعیں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ اور انار کلی کے چاند جیسے مکھڑے کے چاروں طرف ہالے کی مانند معلوم ہوتی تھیں۔

اب وہ اُس بادشاہوں کے بادشاہ کے دربار میں پہنچ چکی تھی۔ جس کے سامنے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ بھی ہیچ ہیں۔

(۸)

خاندان تیموریہ کے سب سے عظیم نامور اور مشہور شہنشاہ اکبر کو خدا کے گھر کا بلاوا آچکا تھا۔ اب اس کی جگہ نور الدین سلیم جہانگیر کے نام سے دہلی کے تخت پر جلوہ افروز تھا۔

انار کلی کی رنجیدہ موت کا واقعہ عاشق سلیم نے دل سے فراموش کر دیا تھا۔ اب وہ ایک دوسرے ہی حسن کا شیدائی تھا۔ اب اس نے مہرالنسا کو دیکھ لیا تھا۔ انار کلی کی یاد اس کے دل سے اس طرح جاتی رہی تھی جس طرح سورج کی روشنی میں تاروں کی روشنی دب جاتی ہے اب اُسے ہر وقت سوتے جاگتے مہرالنسا ہی کا دھیان رہتا تھا۔

ایک دن شام کا وقت تھا۔ جہانگیر شاہی محل کے باغ میں ٹہل رہا تھا اور نور جہاں کے ساتھ اس کی محبت اور اپنی بیوفائی پر غور کر رہا تھا۔ اسی دوران میں کلیوں سے لدے ہوئے ایک انار کے پودے کے سایہ میں ایک سفید چھوٹے سے ٹکڑے پر اس کی نظر پڑی۔ یہ ایک قبر تھی۔ اس سے پہلے اس نے کبھی اس کو نہ دیکھا تھا۔ اس کو حیرت ہوئی کہ یہاں کس کو دفن کیا گیا ہو گا۔ ہاں۔

ایک بڈھا مالی کچھ فاصلے پر پھولوں کی کیاریوں میں پانی دے رہا تھا جہانگیر نے اس کو بلا کر پوچھا۔

"یہ کس کی قبر ہے؟"

مالی نے قبر کی طرف دیکھا اور پھر جہانگیر کی طرف دیکھنے لگا مگر کچھ جواب نہ دے سکا۔ وہ خوف زدہ معلوم ہوتا تھا۔

جہانگیر نے دوبارہ پوچھا۔ "یہاں کون پڑا سوتا ہے؟"

مالی نے رکتے ہوئے کہا۔ "انار کلی بیگم"

"انار کلی"! گذشتہ دنوں کی یاد نے جہانگیر کو بحر خیالات میں غرق کر دیا۔ اس

نے آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ شام کی تاریکی میں اسکو مغرب کی طرف شفق میں
ایک تارہ چمکتا دکھائی دیا۔ اس چمکتے ہوئے ستارے میں شہزادی انار کلی کی تصویر اس کی
آنکھوں میں پھر گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ مہرالنسا کو بھول گیا۔ انار کلی کی یاد اس
کے دل میں پھر ویسے ہی تازہ ہو گئی۔ جیسے کئی برس پہلے تھی۔ وہ اس کی اندوہناک
زندگی کے ایک ایک واقعہ کو یاد کرنے لگا۔ اس کو انار کلی کی وہ مسکراہٹ
یاد آگئی۔ جس کے لئے وہ اپنی جان تک دینے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ قید خانہ میں
انار کلی سے ملاقات رحیم خاں کی سحر کاری اور دغا بازی سارے واقعات
ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔

جہانگیر ان خیالات میں غرق آہستہ آہستہ اپنے محل کو واپس لوٹ آیا۔

دوسرے دن علی الصبح دربار کے معمار کو حکم ہوا کہ انار کلی کی بے نام قبر پر
ایک خوبصورت اور وسیع مقبرہ بنوا دیا جائے۔ اور جواہرات سے جڑی ہوئی
ایک پتھر کی لوح پر ڈھا کر یہ شعر اس پر کندہ کیا جائے۔ ؎

تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را
آہ گر من باز بینم روئے یار خویش را

ہڈیوں کا پنجر

(۱)

جب میں درسی کتابیں پڑھ چکا تو میرے باپ نے مجھ کو فنِ طبابت سکھانا چاہا۔ اور اس کام کے لئے ایک عالم وید کو استاد مقرر کر دیا۔ میرا نیا استاد صرف دیسی طبابت ہی میں ماہر نہ تھا بلکہ ڈاکٹری بھی جانتا تھا۔ اور اس نے انسانی جسم کی بناوٹ سمجھانے کی غرض سے میرے لئے ایک انسان کا ڈھانچہ یعنی ہڈیاں اور پنجر منگا دیا تھا جو اس کمرہ میں جہاں میں پڑھتا تھا۔ رکھا گیا۔ عام لوگ جانتے ہیں کہ مردہ خصوصاً ہڈیوں کے ڈھانچہ سے کمسن بچوں کو جب وہ اکیلے ہوں کس قدر خوف آتا ہے قدرتاً مجھ کو بھی ڈر لگتا تھا۔ اور شروع شروع میں میں کبھی اس کمرہ میں تنہا نہ جاتا تھا۔ اگر کبھی کسی ضرورت کی وجہ سے جانا بھی پڑتا۔ تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ ایک اور طالب علم بھی ہم سبق تھا میرا شریک تھا جو بہت نڈر تھا وہ کبھی اس ڈھانچے سے خوف نہ کھاتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اس مشتِ استخوان کی بساط ہی کیا ہے۔ جس سے کسی زندہ آدمی کو تکلیف پہنچ سکے۔ ابھی ہڈیاں ہیں۔ چند روز بعد خاک ہو جائیں گی۔ مگر میں نے اس بارہ میں کبھی

اس سے اتفاق نہ کیا اور ہمیشہ کہتا رہا کہ گو روح ان ہڈیوں سے جدا ہو گئی ہے تاہم جب تک یہ موجود ہیں وہ وقتاً فوقتاً آکر اپنے پرانے مکان کو دیکھ جایا کرتی ہے۔ میرا یہ خیال بظاہر عجیب و ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ اور کبھی کسی نے یہ نہیں دیکھا ہو گا کہ روح پھر اپنی ہڈیوں میں واپس آئی ہو لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ میرا خیال درست تھا اور درست نکلا۔

(۲)

چند دن کا ذکر ہے۔ ایک رات خانگی مجبوریاں کی وجہ سے مجھے اس کمرہ میں سونا پڑا۔ چونکہ میرے لئے یہ نئی چیز تھی۔ اس لئے نیند نہ آئی۔ اور میں بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ یہاں تک کہ پاس کے گرجا نے بارہ بجائے۔ لیمپ جو میرے کمرے میں روشن تھا مدھم ہونا شروع ہوا۔ اور پھر آہستہ آہستہ گل ہو گیا۔ اس وقت مجھے اس روشنی کی بابت خیال آیا کہ ایک لحظہ پیشتر وہ موجود تھی۔ لیکن اب ہمیشہ کے لئے تاریکی میں بدل گئی۔ دنیا میں انسانی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ جو کبھی رات کو کبھی دن کو ابدی زندگی میں جا ملتا ہے۔

رفتہ رفتہ میرا خیال ہڈیوں کے ڈھانچہ کی طرف منتقل ہونا شروع ہوا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ خدا جانے یہ ہڈیاں اپنی زندگی میں کیا کچھ نہ ہونگی۔ یکایک مجھے ایسا معلوم ہوا گویا کوئی متحرک چیز میرے پلنگ کے گرد تاریکی میں پھر رہی ہے پھر لمبی سانسوں کی آواز جیسے کوئی غمزدہ شخص سانس لیتا ہے میرے کانوں میں آئی اور پیروں کی آہٹ بھی سنائی دی۔ میں نے خیال کیا۔ یہ میرا وہم ہے اور بدخوابی کی وجہ سے خیالی آوازیں آ رہی ہیں۔ مگر پاؤں کی آواز پھر آئی۔ اس پر

میں نے رفع شک کی خاطر زور سے پوچھا " کون ہے ؟" یہ سن کر وہ نامعلوم شکل میرے پلنگ کے قریب آئی اور بولی "میں ہوں، میں اپنی ہڈیوں کو دیکھنے آئی ہوں۔"

میں نے خیال کیا میرا کوئی واقف مجھ سے ہنسی کر رہا ہے۔ اس لئے کہا " یہ کونسا موقعہ ہڈیوں کے دیکھنے کا ہے۔ اصل مدعا کہو۔"

آواز آئی " تجھے وقت بیوقت سے کیا غرض ؟ میری چیز ہے جس وقت چاہوں اسے دیکھ سکتی ہوں۔ آہ ! کیا تم نہیں دیکھتے وہ میری پسلیاں ہیں جن میں مدتوں میرا دل رہا ہے میں پورے ۲۲ سال اس آشیانہ میں مقیم رہی۔ جس کو اب تم ہڈیوں کا ڈھانچہ کہتے ہو۔ اگر میں اپنے پرانے گھر کو دیکھنے چلی آئی تو اس میں تمہارا کیا ہرج ہوا ؟"

میں ڈر گیا اور روح کو ٹالنے کے لئے کہا " اچھا تم جا کر اپنی ہڈیاں دیکھ لو۔ مجھے نیند آتی ہے میں سوتا ہوں۔" میں نے دل میں ارادہ کر لیا کہ جس وقت وہ یہاں سے ہٹے میں فوراً بھاگ کر باہر چلا جاؤں گا۔ لیکن وہ ٹلنے والی اسامی نہ تھی کہنے لگی " کیا تم یہاں تنہا سوتے ہو ؟ اچھا تو کچھ باتیں کریں۔"

اس کا اصرار میرے لئے آفت ناگہانی سے کم نہ تھا۔ موت کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ مگر چار و ناچار جواب دیا " اچھا تو بیٹھ جاؤ۔ اور کوئی مزیدار بات سناؤ۔"

آواز آئی " لو سنو ! ۱۵ سال گزرے ہیں میں بھی تمہاری طرح انسان تھی اور انسانوں میں بیٹھ کر گفتگو کیا کرتی تھی۔ لیکن اب مرگھٹ کے ویرانہ میں پھرتی رہتی ہوں۔ آج میری خواہش ہے کہ پھر ایک عرصہ دراز کے بعد انسانوں سے باتیں کروں۔ میں خوش ہوں کہ تم نے میری باتیں سننے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔

کیوں تم باتیں سننا چاہتے ہو یا نہیں ؟"

یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف آئی. اور مجھے معلوم ہوا کہ کون شخص میری پائنتی پہ بیٹھ گیا ہے. پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی لفظ زبان سے نکالوں. اس نے اپنا قصہ سنانا شروع کر دیا.

اب کوئی چارہ نہ تھا. میں نے حوصلہ کر کے کہا" اچھا کوئی عمدہ کہانی سناؤ."

(۳)

وہ بولی" ارے صاحب جب میں انسانی جامہ میں تھی تو بس ایک شخص سے ڈرا کرتی تھی اور وہ شخص میرے حق میں گویا موت کا فرشتہ تھا. وہ میرا خاوند تھا. جس طرح ایک شخص مچھلی کو کنڈی لگا کر پانی سے باہر نکال لایا ہو یہ شخص مجھ کو میرے والدین کے گھر سے لے آیا تھا. اور مجھ کو وہاں جانے نہ دیتا تھا. شکر ہے اس کا کام جلد تمام ہو گیا. یعنی شادی کے دوسرے مہینے ہی وہ دنیا سے چل بسا. میں نے لوگوں کی دیکھا دیکھی نالہ و شیون کیا ـــــ لیکن دل میں بہت خوشی تھی کہ کانٹا نکل گیا ـــ اب مجھ کو اپنے والدین سے ملنے کی اجازت مل جائے گی ـــ اور میں اپنی پرانی سہیلیوں سے جن کے ساتھ کھیلا کرتی تھی ملوں گی. لیکن لیکن مجھ کو میکے جانے کی اجازت نہ دی گئی تھی کہ ایک میرا خسر گھر میں آیا. اور میرا چہرہ غور سے دیکھ کر اپنی اہلیہ سے کہنے لگا. مجھ کو قیافہ سے یہ لڑکی ڈائن معلوم ہوتی ہے اپنے خسر کے یہ الفاظ مجھ کو اب تک یاد ہیں. اور میرے کانوں میں گونج رہے ہیں ـــ اس کے چند دن بعد مجھے اپنے باپ کے گھر جانے کی [illegible] مل گئی. باپ کے گھر جانے پر مجھ کو جو خوشی حاصل ہوئی. وہ احاطہ بیان سے

باہر ہے۔ میں وہاں ہنسی خوشی رہنے اور اپنی جوانی کے دن گزارنے لگی۔ میں نے ان دنوں بارہا اپنی نسبت لوگوں کو کہتے سُنا کہ میں خوب صورت نازنین ہوں۔ مگر تم کہو۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں نے تمہیں زندگی کی حالت میں دیکھا نہیں۔ میں کیسے رائے دے سکتا ہوں۔ جو کچھ تم نے کہا درست ہوگا۔"

وہ بولی۔ "میں کس طرح یقین دلاؤں کہ ان دو خانوں میں دو سرمگیں آنکھیں دیکھنے والوں پر بجلیاں گراتی تھیں۔ افسوس تم میرے اصلی تبسم کا اندازہ ان ہڈیوں کے کھلے منہ سے نہیں لگا سکتے ان ہڈیوں پر گوشت خوبصورتی تھی۔ اب اس کا نام تک باقی نہیں ہے۔ میری زندگی کے ایام میں کوئی لائق سے لائق ڈاکٹر بھی گمان نہ کر سکتا تھا۔ کہ میری ہڈیاں تشریح جسم انسانی کے کام آئیں گی۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب میں چلا کرتی تھی۔ تو نور کی شعاعیں میرے بال بال سے نکل نکل کر ہر سمت کو منور کرتی تھیں۔ میں اپنے بازوؤں کو گھنٹوں دیکھا کرتی۔ آہ! یہ وہ بازو تھے۔ کہ جس کو میں نے دیکھا اپنا فریفتہ کر لیا۔ شاید سعید ا کو بھی ایسے گول اور سڈول بازو نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔ میری چھوٹی نازک انگلیاں پنجہ مرجان کو شرماتی تھیں — افسوس میرے اس برہنہ ڈھانچے نے تمہیں میرے حسن و جمال کی نسبت بالکل غلط رائے قائم کرنے کا موقعہ دیا۔ تم مجھ کو ایام شباب میں دیکھتے تو آنکھوں سے نیند اڑ جاتی۔ اور علم تشریح کا سودا دماغ سے حرفِ غلط کی طرح محو ہو جاتا۔

میں نے جواب دیا۔ یقین جانو تمہاری اس گفتگو سے طب کی ساری معلومات

میرے دماغ سے خارج ہو گئی ہیں اور تمہاری دلکش خوبصورتی میرے دل پر نقش ہو گئی ہے۔ بہرحال آگے کہو۔"

اس نے سلسلہ کلام جاری رکھ کر کہا "میرے بھائی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی نہ کرے گا۔ اس لئے گھر میں میں ہی ایک عورت تھی۔ میں شام کو اپنے باغ میں سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھتی تو ستارے مجھ کو گھورا کرتے اور ٹھنڈی ہوا جب میرے پاس سے گزرتی تو میرے سامنے اٹکھیلیاں کرتی تھی۔ میں اپنے حسن کے غرور میں بارہا سوچا کرتی کہ جس زمین پر میرا قدم پڑتا ہے اگر اس میں محسوس کرنے کی قدرت ہوتی تو خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ کبھی کہتی دنیا کے سارے عاشق مزاج نوجوان گھاس کے بھیس میں میرے قدموں پر پڑے ہیں اب یہ تمام خیالات مجھ کو بارہا پریشان کرتے ہیں کہ آہ! کیا تھا اور کیا ہو گیا۔

میرے بھائی کا ایک دوست ستیش کمار تھا جس نے میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی سند حاصل کی تھی۔ وہ ہمارا بھی خانگی ڈاکٹر تھا۔ گو اس نے مجھ کو نہیں دیکھا تھا مگر میں نے اس کو ایک روز دیکھ لیا۔ اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اس کی خوبصورتی نے مجھ پر خاص اثر کیا۔ میرا بھائی عجیب طرح کا آدمی تھا۔ زمانہ کے سرد و گرم سے بالکل ناآشنا وہ کبھی گھر کے کاموں میں دخل نہ دیتا تھا۔ زیادہ تر خاموشی پسند اور تنہائی میں رہا کرتا تھا۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین بن گیا۔ اور عارفانہ زندگی بسر کرنے لگا۔

ہاں تو وہ نوجوان ستیش کمار ہمارے ہاں اکثر آتا اور یہی ایک نوجوان تھا جس کو اپنے گھر کے مردوں کے سوا مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا جب میں باغ میں

تنہا ہوتی اور پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کے نیچے ملکہ کی طرح ٹہلتی تو ستیش کی ارکا خیال اور بھی میرے دل میں چٹکیاں لیتا۔ لیکن تم کس فکر میں ہو تمہارے دل میں کیا گزر رہا ہے؟"

میں نے آہ سرد بھر کر جواب دیا۔ میں یہ خیال کر رہا ہوں کہ کاش میں ہی ستیش ہوتا۔"

وہ ہنس کر بولی "اچھا پہلے میری کہانی سن لو پھر عشق بازی کر لینا۔ ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ مجھے قدرے بخار تھا کہ اس وقت ڈاکٹر یعنی میرا پیارا استیش مجھے دیکھنے کے لئے آیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بالمقابل دیکھا اور دیکھتے ہی ڈاکٹر کو سکتہ سا ہو گیا۔ اگرچہ میرے بھائی کی موجودگی نے اُسے ہوش سنبھالنے پر مجبور کر دیا۔ وہ میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ میں ان کی نبض دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے آہستہ سے اپنا بازو دوشالہ سے نکالا۔ ڈاکٹر نے میری نبض پر ہاتھ رکھا۔ میں نے کبھی نہ دیکھا تھا کہ کسی ڈاکٹر نے معمولی بخار کی تشخیص میں اس قدر تامل کیا ہو۔ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ سخت جدوجہد کے بعد اس نے میرے بخار کا اندازہ لگایا۔ لیکن میرا بخار دیکھتے دیکھتے بذاتِ خود بیمار ہو گئے۔ کیوں؟ تم اس بات کو مانتے ہو یا نہیں؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "ہاں بالکل مانتا ہوں۔ آدمی کی حالت میں تغیر پیدا ہونا کیا مشکل ہے؟"

وہ بولی: "چند روز امتحان کرنے سے معلوم ہوا کہ میرے دل میں ڈاکٹر کے سوا اور کسی نوجوان کا خیال تک نہیں۔ میرا معمول تھا شام کے وقت بسنتی رنگ کی ساڑھی پہن کر بالوں میں کنگھی کر کے پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر شیشہ ہاتھ میں لئے

باغ میں چلی جاتی اور پہروں دیکھا کرتی۔ کیوں کیا آئینہ دیکھنا معیوب ہے؟"

میں نے گھبرا کر جواب دیا "نہیں تو"

اس نے سلسلۂ حکایت جاری رکھ کر کہا "آئینہ دیکھ کر میں محسوس کرتی تھی۔ گویا میری دو زندگیاں ہو گئی ہیں یعنی میں خود ہی ستیش کمار بن جاتی اور خود ہی اپنے عکس کو معشوق سمجھ کر اس پر نقدِ دل نثار کرتی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ میری نہایت مرغوب تفریح تھی۔ اور میں گھنٹوں اس میں گزار دیا کرتی۔ بارہا ایسا ہوا کہ دوپہر کو پلنگ پر بستر بچھا کر سوتی اور ایک بازو کو بستر پر نہایت لاپرواہی سے پھینک دیا۔ ذرا آنکھ جھپکی تو خواب میں دیکھا کہ ستیش کمار آیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دے کر چلا گیا۔ بس اب میں کہانی ختم کرتی ہوں۔ تمہیں تو نیند آ رہی ہے"

میری دلچسپی بہت بڑھ چکی تھی۔ اس لیے میں نے منت کے لہجہ میں کہا "نہیں تم کہے جاؤ میرا شوق بڑھتا جاتا ہے"

وہ کہنے لگی "اچھا سنو۔ تھوڑے دنوں میں ستیش کمار" کا کاروبار بہت بڑھ گیا۔ اور اس نے ہمارے مکان کے نچلے حصہ میں اپنا مطب کھول لیا۔ جب اس کو مریضوں سے فرصت ہوتی تو میں اس کے پاس جا بیٹھتی اور ہنسی ٹھٹھے میں مختلف دواؤں کا نام پوچھتی رہتی۔ اس طرح مجھے ایسی دوائیں بھی معلوم ہو گئیں۔ جو زہر قاتل تھیں۔ ستیش کمار سے جو کچھ میں دریافت کرتی بڑی محبت اور متانت سے بتایا کرتا۔ اس طرح ایک طویل عرصہ گزر گیا اور میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ ڈاکٹر مفقود الحواس رہتا ہے۔ اور جب کبھی میں اس کے سامنے جاتی ہوں تو اس کے چہرے پر مردنی سی چھا جاتی ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس

کی کچھ وجہ معلوم نہ ہوئی۔ ایک دن ڈاکٹر نے میرے بھائی سے گاڑی مانگی میں پاس بیٹھی تھی۔ میں نے بھائی سے پوچھا۔ ڈاکٹر اس وقت رات میں کہاں جائے گا۔ میرے بھائی نے جواب دیا۔ تباہ ہونے کو۔" میں نے اصرار کیا کہ مجھے ضرور بتاؤ۔ وہ کہاں جا رہا ہے؟ بھائی نے کہا وہ شادی کرنے جاتا ہے۔ یہ سن کر مجھ پر غشی سی طاری ہوگئی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور بھائی سے پھر پوچھا کیا وہ سچ مچ شادی کرنے جاتا ہے یا مذاق کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا۔ درست ہے آج ڈاکٹر دلہن لائیگا۔

میں نہیں بتا سکتی مجھے یہ بات کس قدر شاق گزری میں نے اپنے دل سے بار بار پوچھا کہ ڈاکٹر نے یہ بات مجھ سے کیوں پوشیدہ رکھی کیا میں اس کو روکتی کہ شادی مت کرو؟ ان مردوں کی بات کا کچھ اعتبار نہیں۔"

سہ پہر کو ڈاکٹر مریضوں کو دیکھ کر مطب میں آیا اور میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب "کیا یہ درست ہے کہ آج آپ کی شادی ہے" یہ کہہ کر میں بہت ہنسی اور ڈاکٹر یہ دیکھ کر کہ میں اس کو ہنسی میں اڑا رہی ہوں نہ صرف شرمندہ ہوا بلکہ کچھ متفکر سا ہو گیا۔

پھر میں نے یکایک پوچھا "ڈاکٹر صاحب جب آپکی شادی ہو جائیگی تو کیا آپ پھر بھی لوگوں کی نبض دیکھا کرینگے۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں اور ڈاکٹروں کی نسبت مشہور ہے کہ وہ جسم کے تمام اعضا کا حال جانتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ ڈاکٹر ہو کر کسی کے دل کا پتہ نہیں لگا سکتے کہ وہ کس حالت میں ہے حالانکہ دل بھی جسم کا ایک حصہ ہے۔"

میرے الفاظ ڈاکٹر کے دل میں تیر کی طرح لگے۔ مگر وہ خاموش رہا۔

(۴)

لگن کا مہورت بڑی رات گئے مقرر ہوا تھا اور برات دیر سے جانا تھا اس لئے

ڈاکٹر اور میرا بھائی حسب معمول شراب پینے بیٹھ گئے۔ اس شغل میں ان کو بہت دیر ہوگئی۔

گیارہ بجنے کو تھے کہ میں اُن کے پاس گئی اور کہا۔ ڈاکٹر صاحب گیارہ بجنے والے ہیں آپ کو شادی کے لئے تیار ہونا چاہیئے۔ وہ کسی قدر سرور میں ہوگیا بولا ابھی جاتا ہوں پھر وہ میرے بھائی کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگیا اور میں نے موقعہ پاکر زہر کی پڑیا جو میں نے دوپہر کو ڈاکٹر کی غیر حاضری میں اس کی الماری سے نکالی تھی شراب کے گلاس میں جو ڈاکٹر کے سامنے رکھا ہوا تھا ڈال دی۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر نے اپنا گلاس ختم کیا اور دولھا بننے کو چلا گیا۔ میرا بھائی بھی اس کے ہمراہ روانہ ہوا۔

میں بالائی کمرہ میں گئی اور اپنا نیا بنارسی دوپٹہ اوڑھا، ماتھے پر سیندور لگایا اور پوری سہاگن بن کر باغ میں نکلی جہاں ہر روز شام کو بیٹھا کرتی تھی اس وقت چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ہوا میں خنکی پیدا ہوگئی تھی اور چنبیلی کی خوشبو نے باغ کو مہکا دیا تھا میں نے پڑیا کی باقیماندہ دوا نکالی اور منہ میں ڈال کر چلو بھر پانی پی لیا۔ تھوڑی دیر میں میرے سر میں چکر آنے لگا۔ آنکھوں میں غنودگی چھاگئی۔ چاند کی روشنی مدھم ہونے لگی۔ اور زمین و آسمان بیل بوٹے۔ میرا گھر جہاں میں نے اس قدر عمر گزاری تھی۔ رفتہ رفتہ غائب ہوتے معلوم ہوئے اور میں میٹھی نیند سوگئی۔

ڈیڑھ سال کے بعد خواب راحت سے چونکی تو میں نے دیکھا کہ تین لڑکے میری ہڈیوں سے علم تشریح سیکھ رہے ہیں اور ایک استاد میری چھاتی کی طرف بید سے اشارہ کرکے لڑکوں کو مختلف ہڈیوں کے نام بتا رہا ہے اور کہتا ہے یہاں دل رہتا ہے جو شادی و غم کے وقت دھڑکا کرتا ہے اور یہ وہ جگہ ہے۔ جہاں اٹھتی جوانی کے وقت شگوفے نکلتے ہیں۔ اچھا اب میری کہانی ختم ہے۔ میں رخصت ہوتی ہوں۔ تم سو جاؤ۔"

خاموش حسن

(۱)

جس وقت لڑکی کا نام سوبھا رکھا گیا تو کون کہہ سکتا تھا کہ وہ بڑی ہو کر بدقسمت ثابت ہو گی وہ اگرچہ طاقتِ گویائی سے محروم تھی تاہم نادان نہ تھی وہ اس بات کو سمجھتی تھی کہ خدا نے اسے اپنے والدین کے گھر بطور ملامت کے لیے بھیجا ہے۔ اس لئے عوام سے دور رہنے کی کوشش کرتی تھی وہ خاصی جوان تھی۔ اس وجہ سے والدین رات دن فکرمند رہا کرتے تھے۔ خصوصاً اس کی ماں بڑی بے چین نظروں سے اُسے دیکھتی تھی۔ ماں کو بیٹے کی نسبت بیٹی سے زیادہ محبت ہوا کرتی ہے۔ اس میں اگر کوئی عیب ہو تو وہ اس سے اپنی ذلت محسوس کرتی ہے رام پرشاد سوبھا کا باپ بہ نسبت اور بیٹیوں کے اس سے زیادہ محبت کرتا تھا مگر اس کی ماں اسے اپنے جسم کا ایک بدنما داغ خیال کرتی تھی۔ اگر سوبھا میں گویائی نہ تھی تو کیا اس کی بڑی سیاہ آنکھیں بھی نہ تھیں۔ جس وقت کوئی خیال اُس کے دماغ میں پیدا ہوتا اسی کے ہونٹ خود بخود متحرک ہو جاتے۔

جب ہم اپنا خیال ظاہر کرتے اور بولتے ہیں تو اس کی ابتدا کے لیے الفاظ کا تجویز کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ خیالات کی ترجمانی کا ایک قاعدہ ہوا کرتا ہے

ہوا کرتی۔ غلط بھی ہوتا ہے اس میں پڑ کر اکثر ہم بھی غلطی کھا جاتے ہیں لیکن سیاہ آنکھیں
تو ترجمانی کرنے کے لیے الفاظ کی محتاج نہیں ہوا کرتیں۔

دماغ خود بخود ان پر ایک سایہ ڈالتا ہے۔ اور اُن میں خیال کی جھلک نمایاں
ہو کر کھو جاتی ہے۔ خیال پتلیوں کی سیاہی سے اس طرح نمودار ہوتا ہے جیسے طرح غروب
ہونے والا آفتاب یا بادلوں میں چمکنے والی بجلی۔

جو لوگ فطرتاً سوائے جنبش لب کے اور کوئی دوسری گویائی نہیں رکھتے۔ وہ
آنکھوں سے زبان کا کام لیا کرتے ہیں، جن کی قوت اظہار لامحدود سمندر کی طرح ہوا
کرتی ہے اور جس میں صبح و شام روشنی تاریکی میں پنہاں ہو جاتی ہے گویا کہ نگوں میں
قدرت کا ایک شاندار سکوت مستور ہو جاتا ہے۔

سوبھا چاندی پور کے ایک معمولی چھوٹے سے موضع میں رہا کرتی تھی دریا جس
کے کنارے پر آبادی تھی۔ اس کے دونوں طرف سایہ دار درخت تھے۔ اس طرح
اُگے ہوئے درختوں کے باعث گریا ندی کی خوبصورت دیوی اپنے تخت شاہانہ سے
اتر کر چمن زار کی مالکہ بن گئی تھی۔ اُس کی روانی اپنے آپ سے بے بہرہ بے خبر
اپنے کام کی انجام دہی میں مشغول رہتی اور ہر دل سے دعائیں لیتی۔ رام پرشاد
کا مکان اس چشمہ کی طرف آبادی سے نکلا ہوا تھا۔ اور کشتی میں بیٹھنے والوں کو
آبادی کی ہر جھونپڑی اور مکان کا ہر حصہ صاف نظر آتا تھا۔ معلوم نہیں
اس دنیاوی دولت کے درمیان اس چھوٹی لڑکی کا بھی کسی کو خیال تھا جو اپنا کام
کرکے چشمے کے کنارے پر آ بیٹھتی اور قدرت کی خاموشی سے ہم کلام رہتی تھی۔

اس جگہ چشمہ کی روانی کی آواز، گاؤں کے باشندوں کا شور و غل، ملاحوں

کی نغمہ سرائی اور پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ ایک دوسرے سے مل کر اس کے دل کو مضطرب کر جاتی۔ یہی شور و غل اور قدرت کی نیرنگیاں اس لڑکی کی گویائی تھی۔ سیاہ آنکھیں نہ بان تھیں جن پر لمبی لمبی پلکیں سایہ کئے ہوئے تھیں۔ اور یہی شور و غل اس کے نزدیک دنیا والوں کی زبان تھی۔

اس جلہ دریا کے نزدیک درخت کی چوٹی سے لے کر خاموش تاروں تک رلاتے اور سرد آہیں بھرنے کا ساماں مہیا تھا۔

ٹھیک دوپہر کو جب ملاح اور ماہی گیر کھانا کھانے کے لئے چلے جاتے سب گاؤں والے سو جاتے۔ چڑیاں خاموش ہو جایا کرتیں جب گھاٹیوں پر سکوت چھا جاتا دنیا تھک کر خاموش ہو جاتی اور تنہائی کی ایک خوفناک صورت اختیار کر لیتی۔ اس وقت بلند آسمان کے نیچے یہ گونگی لڑکی کسی چھوٹے سے درخت کے سایہ میں بیٹھ جاتی۔

سوبھا دوستوں سے محروم تھی۔ اُس کے گھر میں دو گائیں تھیں۔ ان دونوں نے سوبھا کے منہ سے اپنا نام کبھی نہ سنا تھا تاہم وہ اس کے پاؤں کی آہٹ کو خوب پہچان لیا کرتی تھیں۔ گو ان کی زبان نہ تھی مگر وہ اس کی مشفقانہ مگر بے الفاظ محبت بھری گفتگو خوب سمجھتی تھیں۔ اس کے اشاروں سے وہ اس قدر اثر پذیر ہوا کرتی تھیں جتنی کہ ایک عمر رسیدہ آدمی سے بھی نہ ہو سکتی تھی۔ سوبھا ان تک آتی اور ان کی گردن میں اپنے دونوں ہاتھ ڈال دیا کرتی۔ اپنے نرم نرم رخسار اُن کے رخساروں سے ملا کرتی۔ سوبھا کم از کم تین مرتبہ انہیں روزانہ دیکھنے آتی اور زیادہ سے زیادہ جتنی مرتبہ بھی ہو سکے۔ جب کبھی اسے کوئی برُا کہتا وہ اپنے ان گونگے دوستوں

کے پاس چلی آتی. خواہ وہ وقت اس کے آنے کا ہو یا نہ ہو اور گا بیٹی اس کے روحانی درد اور خاموش زندگی کا اپنے دل پر اثر محسوس کرتیں. اس کے قریب آ کر وہ اپنے سینگ آہستہ آہستہ اس کے بازوؤں سے رگڑتی رہتیں اور اپنی بدحواسی اور بے زبانی کے طریق پر اس کا غم غلط کرنے کی کوشش کرتیں۔

(۳)

گایوں کے علاوہ اس گھر میں کچھ بکریاں اور ایک بلی کا بچہ بھی تھا. مگر وہ ان سے اتنی محبت نہ کرتی تھی. گو وہ سب اسے ویسی ہی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے دن رات میں بلی کا بچہ جب کبھی موقعہ پاتا. اس کی گود میں آ کر لیٹ جاتا اور جب سوبھا اپنی انگلیاں اس کی پشت اور گردن پر پھیرتی تو سو جاتا۔

اشرف المخلوقات میں بھی سوبھا کا ایک دوست تھا. مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے تعلقات اس کے ساتھ کس قسم کے تھے۔

اس کو گویائی حاصل تھی اور اس کی گویائی سوبھا کی خاموش گویائی کو بھی بعض اوقات چھین لیتی یہ گوسائیں کا چھوٹا لڑکا پرتاپ تھا جہاں دلوں بیکار تھا اور جس کے والدین کی امیدیں اس کے طریق معاش کے متعلق منقطع ہو چکی تھیں۔

نکلے وہ آدمی اپنے عزیزوں کو ہی ناراض کر کے غیر لوگوں میں عزیز ہوا کرتے ہیں. اور چونکہ ان کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا. اس لیے وہ عوام کی ملکیت ہو جاتے ہیں جس طرح ایک شہر کو ایک کشادہ میدان کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ لوگ آرام سے سانس لے سکیں. اسی طرح ایک موضع کو چند بیکار آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ امیر آدمی اپنا بیکار وقت ان کی گپ بازی میں گزار سکیں۔

پرتاپ کا خاص شوق مچھلیاں پکڑنا تھا اس شوق میں وہ اپنا بہت سا وقت ضائع کرتا اور قریب قریب ہر سہ پہر کو اس میں مشغول پایا جاتا۔

اپنے اسی شوق کی وجہ سے وہ سوبھا سے روشناس ہوا۔ خواہ وہ کچھ کام کرتا مگر ایک دوست کا قدر دان ضرور رہتا۔ پرتاپ اس کی خاموشی کی وجہ سے سوبھا کی بہت عزت کرتا اور اس کے انتظار میں رہتا تھا۔

سوبھا ایک املی کے درخت کے نیچے بیٹھا کرتی تھی اور پرتاپ ذرا دور بیٹھ کر اپنی ڈوری ڈالے رہتا۔ وہ اپنے ساتھ روزانہ چند پان لایا کرتا جن کو سوبھا وہاں بیٹھی ہوئی اس کے لئے بنایا کرتی تھی۔

دیر تک بیٹھے رہتے اور یہ کیفیت کے دوران سوبھا کی دلی خواہش یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو پرتاپ کا مددگار ثابت کرے کہ وہ اس دنیا پہ بیکار بوجھ نہیں ہے مگر وہاں اس اظہار کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ وہ خدا سے ایک غیر معمولی طاقت حاصل کرنے کی دعا کرتی تاکہ وہ اپنی کرامات سے پرتاپ کو متحیر کر سکے اور پھر اس کی زبان سے یہ الفاظ سن سکے۔ میرے خواب میں بھی ایسا نہ تھا کہ میری سوبھا ایسا کر سکے گی۔

اگر سوبھا پری ہوتی تو وہ دریا میں غوطہ زن ہو کر بجائے ایک مچھلی کے پرتاپ کے لئے بہت سے جواہرات لے آتی۔ اور پرتاپ اسی وقت اپنا شکار چھوڑ کر سراپا حیرت بن جاتا۔ اس وقت سوبھا جواہرات سے منور ہونے والے شہر کے بادشاہ کی بیٹی معلوم ہوتی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ ناممکن تھا ویسے ناممکن تو حقیقتاً کوئی کام نہیں مگر دشوار بات تو یہ تھی کہ وہ کسی شاہی خاندان میں پیدا نہ ہوئی تھی بلکہ ایک غریب

خاندان کی چشم و چراغ تھی اور اس وجہ سے گوسائیں کے لڑکے کو تیج کرنے کا
کوئی ذریعہ نہ پاتی تھی۔

سوبھا بڑھتی گئی اور رفتہ رفتہ اپنے آپ کو جانتی گئی۔ اسی دوران میں ایک
ناقابل اظہار خیال سمندر کے ساحل کے مقامات سے اٹھنے والی موجوں کی طرح جبکہ پورا
چاند ہوتا ہے اس کے دماغ میں پیدا ہوا اور وہ اپنے آپ کو اوپر سے نیچے تک دیکھ
اور خیال کرتی مگر ایسا کوئی جواب نہ پاتی جسے وہ سمجھ سکتی ہو۔

ایک دن رات کو بہت دیر گئے جب پورا چاند نمودار ہوا تھا اس نے اپنے
مکان کا دروازہ ذرا آہستہ آہستہ اور ڈرتے ڈرتے باہر جھانکنے کے لئے کھولا۔
باہر جھانکا اس وقت قدرت بھی سوبھا کی طرح تنہا زمین کی طرف دیکھ رہی تھی

(۳)

سوبھا کی مستقبل مضبوط اور جوان زندگی یہ عالم دیکھ کر بیتاب ہوگئی اور رنج و غم
سے اس کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ پہلے بھی وہ تنہا تھی مگر اس عالم تنہائی نے اس کے
خیال کو اور بھی شدید بنا دیا۔ اس وقت اس کا دل اور زیادہ بھاری ہوگیا۔ اور
وہ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکال سکی۔

سوبھا کی شادی کے خیال نے اس کے والدین کے دل کو بڑی فکر میں ڈال دیا تھا
کیونکہ لوگ اکثر ان کو برا بھلا کہتے اور اپنی برادری سے خارج کرنے کی دھمکی دیتے۔ آخر
پریشان ہو کر رام پرشاد نے بیوی سے کہا: ہم کو کلکتہ چلے جانا چاہئیے۔ اور اس کے
بعد وہ ایک اجنبی جگہ پر جانے کیلئے تیار ہوگئے۔ یہ دیکھ کر سوبھا کا دل بھر آیا۔ آنکھیں
کہر آلود شبنم کی طرح تر ہوگئیں۔ ان تمام باتوں کے دوران میں ایک سہ پہر کو پرتاپ شکار

کرتے کرتے سوبھا سے کہنے لگا "تمہارے والد نے تمہارا بر تلاش کر لیا ہے اور ایسے تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ دیکھو! تم مجھے بالکل نہ بھول جانا" یہ کہہ کر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

جس طرح خوفزدہ ہرنی اپنے شکاری کا منہ تکتی ہے۔ اور اپنی خاموش تکلیف میں دریافت کرتی ہے کہ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ اسی طرح سے سوبھا پرتاپ کی طرف دیکھتی رہی اور وہ اس روز زیادہ دیر تک نہ بیٹھی۔

رام پرشاد اپنی خوابگاہ میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا کہ سوبھا نے اسے دیکھ کر روتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے پاؤں پر لا ڈالا۔ باپ نے اسے تسلی دینی چاہی اور اس کے رخسار بھی اشک آلود ہو گئے۔

آخر یہ قرار پایا کہ وہ اگلی صبح کو کلکتہ روانہ ہو جائیں۔ سوبھا نے گائیوں کے قریب آ کر اپنے پرانے دوستوں کو الوداع اور خیر باد کہی ایک دفعہ پھر اپنے ہاتھوں سے ان کو کھلایا پلایا۔ ان کو گلے سے لگایا اور ان کا چہرہ غور سے دیکھا اسی وقت اس کی وہ آنکھیں جو کہ زبان کا کام دیتی تھیں تیزی کے ساتھ آنسو بہانے لگیں۔ جس رات کا یہ واقعہ ہے وہ چاند کی دس تاریخ تھی۔

(۴)

سوبھا اپنے کمرے سے نکل کر دریا کے کنارے آ لیٹی اور اپنے دونوں ہاتھ زمین پر اس طرح پھیلا دیئے۔ گویا وہ اپنی بے رحم ماں سے کہہ رہی ہو "مجھے پرتاپ سے جدا نہ ہونے دو۔"

ایک دن کلکتہ کے کسی مکان میں سوبھا کی ماں نے سوبھا کو بہت اچھا طرح کے ساتھ

کپڑے پہنائے اس کے بالوں کو آراستہ کیا زیور پہنایا۔ اور اس کی رعنائیوں کو چمکانے کی بہت کوشش کی یہ دیکھ کر سوبھا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

اس کی ماں نے خیال کیا کہ شاید یہ رنجیدہ ہے۔

اسی اثنا میں دولہا دلھن کو دیکھنے کے لیے مع اپنے دوستوں کے آیا۔ سوبھا کے والدین پریشان تھے کہ دیکھئے یہ دیوتا سوبھا کو پسند کرتا ہے یا نہیں۔ منتخب شوہر کے روبرو بھیجنے سے پہلے سوبھا کی ماں خاموش رہنے کی تلقین کر چکی تھی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بیقرار تھی۔ دولہا نے دیر تک اوپر سے نیچے تک دیکھا اور یہ حرف کہا ”ایسی خراب بھی نہیں“

اس نے اس کے رونے پر خاص توجہ کی اور خیال کیا کہ شاید یہ اس کے نرم دل ہونے کی دلیل ہے۔ آنسوؤں نے سوبھا کی قدر و منزلت بڑھا دی۔ اور دولہا نے اس میں کوئی نقص نہ پایا۔ آخر مبارک دن شادی کے لیے تجویز ہوا۔ اور شادی ہو گئی۔ پھر سوبھا کے والدین اپنے وطن واپس آگئے۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ دین و دنیا کی برائی سے بچ گئے۔ کچھ دنوں بعد یہ معلوم ہو گیا اور یہ سب کو معلوم ہو گیا کہ دلہن گونگی ہے۔ اگر ایک آدھ آدمی کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ تو اس میں سوبھا کا کیا قصور تھا اس نے کسی کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کی تھی۔

وہ ہر ایک پر نظر ڈالتی مگر کوئی اس کی بات کو نہ سمجھ سکتا تھا۔ آہ! بچپن سے جو اس کی زبان کو سمجھتے تھے وہ اس کے پاس موجود نہ تھے۔ اے کاش! اس کے والدین اس کے جذبات کو سمجھتے اور اسے پرتاپ کی نذر کر دیتے

---

(۱)

"ڈاکٹر جی! ڈاکٹر جی!!"

رات کے سناٹے میں میں اس آواز کو سن کر چونک پڑا۔ دریافت پر
معلوم ہوا کہ وہ ہمارے مالک مکان دکھن بابو تھے۔

میں نے بہ عجلت ان کو اندر بلوایا۔ کرسی پیش کی پھر ان کو بٹھا کر متجسس نگاہوں
سے دیکھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو دیکھا ٹھیک ڈھائی بجے کا وقت تھا۔

دکھن بابو کا چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں بے ارادہ تاک رہی تھیں۔

"آج رات کو بیماری کی علامتیں پھر ظاہر ہونے لگیں"۔ انہوں نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کی دی ہوئی دوا کچھ بھی فائدہ بخش ثابت نہیں ہوئی۔

"مجھ کو اندیشہ ہے کہیں آپ نے پھر سے شراب پینا تو شروع نہیں کر دیا"
میں نے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

دکھن بابو کچھ ناراض سے نظر آنے لگے۔ میرے اس بیباکانہ سوال پر وہ
چند سکنڈ خاموش رہے پھر بولے:-

"یوں تو تم اچھے عقلمند ہو لیکن خدا جانے اس معاملہ میں کیوں بے سمجھ بن رہے ہو۔ میری ایسی حالت کی وجہ شراب نہیں۔ تمہیں لازم ہے کہ پہلے اس کہانی کو شروع سے آخر تک سن لو۔ اور غور سے اچھی طرح سن لو۔ اس کے بعد تم میرے خیال میں سارے معاملات سہولت سے سمجھنے کے قابل ہو جاؤ گے۔"

طاق پر دھیما چراغ جل رہا تھا۔ اُسے تیز کرنے سے روشنی گو زیادہ ہو گئی۔ لیکن ساتھ ہی دھواں نکلنے لگا۔ اپنی چادر کو کندھے پر کھینچ کر اور ایک بڑے ٹرنک پر اخبار کا پرانا کاغذ بچھا کر میں ہمہ تن گوش ہو بیٹھا۔

دکھن بابو نے یوں اپنی کہانی بیان کرنی شروع کی۔

"کوئی چار سال کا عرصہ ہوا۔ مجھ پر ایک خطرناک بیماری کا حملہ ہوا۔ جس سے میری حالت بہت خراب ہو گئی۔ آخر موت کے قریب پہنچ کر بیماری نے پلٹا کھایا اور مرض میں کمی محسوس ہونے لگی۔ اس کے بعد صحت حاصل کرتے میں پورا ایک مہینہ لگ گیا تھا۔

میری بیماری کے ایام میں میری بیوی نے ایک لمحہ کے لئے بھی چین نہ لیا اور دن رات میری خدمت میں رہنے لگی۔ اس کمزور عورت نے اپنی پوری طاقت سے موت کے قاصد کو دور بھگانے کی کوشش کی جو میرے بالکل قریب آ گیا تھا۔ اس کے دن بغیر کھائے پیئے گذرنے لگے۔ اسے نہ دن کو چین تھا نہ رات کو اطمینان۔ اگر کچھ فکر تھی تو میری تیمارداری یا صحت کی اور بس اُسے دنیا کی کسی دوسری چیز کے بارے میں خیال تک نہ تھا وہ ہر وقت میرے پلنگ کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ ایک زبردست شیر کی طرح حریف سے ہار کر موت مجھے اپنا

نوالہ نہ بنا سکی۔ لیکن بھاگتے ہوئے اس کی ایک تیز جھپٹ سے میری بیوی محفوظ نہ رہ سکی۔

اس کے کچھ روز بعد میری بیوی کے ایک مرا ہوا بچہ پیدا ہوا۔ اب خدمت کرنے کی میری باری تھی۔

لیکن میری موجودگی میں وہ میری ہی تکلیف کا خیال کر کے بےچینی محسوس کرتی تھی کیونکہ اکثر وہ مجھ سے کہا کرتی۔

"پرماتما کے لئے تم بیمار کے کمرے میں آنے جانے کی تکلیف گوارا نہ کیا کرو"۔

اس کے بخار کے وقت جب میں اس کے کمرے میں جاتا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر گرمی کے بہانے خود کو پنکھا کرتے ہوئے اُسے بھی پنکھا کرتا۔ تو وہ بڑا آزردہ ہو جاتی۔ اس کی خدمت کرنے کی وجہ سے میرے کھانے میں اگر دس منٹ کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ میرے لئے نوکروں کو پریشان کر دیتی۔ اگر میں اس کا کوئی ادنیٰ سا کام بجا لانے کی کوشش کرتا تو اس کا اثر بالکل الٹا ہوتا اور وہ کہہ اٹھتی "مردوں کے لئے یہ ڈھنگ اختیار کرنا ٹھیک نہیں"۔

میرے خیال میں میرا باغ والا مکان تم نے دیکھا ہوگا۔ ٹھیک اس کے سامنے باغ ہے جس کے کنارے گنگا بہہ رہی ہے۔ ہمارے آرام گھر کے سامنے باغ میں میری بیوی نے ایک خوبصورت کنج اپنا دل بہلانے کے لئے بنوایا تھا اور اسے اس نے مہندی کی جھاڑیوں سے گھیر دیا تھا۔ باغ کا

وہ حصہ انتہائی خوبصورتی اور سادگی لیے ہوا تھا۔ بناوٹی خوبصورتی کو اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ چھوٹی کیاریوں میں چنبیلی۔ گلاب۔ لیموں اور دوسری قسم کے پودے اُگے ہوئے تھے۔ ایک طرف بکل کا شاندار درخت تھا جس کے نیچے میری بیوی نے ایک سفید پتھر کا چھوٹا سا چبوترہ شوق سے بنوایا تھا۔ جسے وہ خود دن میں دو مرتبہ دھویا کرتی تھی۔ لیکن یہ اُس وقت کا میں ذکر کر رہا ہوں جب اس کی صحت بالکل اچھی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی۔ جہاں گرمیوں کے موسم میں اپنا روزمرہ کام ختم کرنے کے بعد شام کے وقت وہ بیٹھنے کی عادی تھی۔ وہاں سے دریا اور اس کے کنارے سے بل کھاتی ہوئی لال سڑک اور دریا سے گذرنے والے چھوٹے بادبانی جہاز اور کشتیاں بخوبی نظر آتی تھیں۔ لیکن وہ خود راہگیروں اور مسافروں کی نگاہ سے پوشیدہ رہتی تھی۔

(۲)

گرمیوں کے دنوں میں ایک رات جب کہ چاند اپنی دلکش ٹھنڈی روشنی سے دنیا کو منور کر رہا تھا۔ اپنی طویل بیماری سے قدرے صحتیاب ہوئے پر اُس نے اپنے کرہ سے نکل کر اصلی باغ میں بیٹھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے نہایت احتیاط سے اُسے اٹھایا۔ اور اس پتھریلے سفید چبوترے پر لاکر آہستگی سے لٹا دیا جو کہ "بکل" کے سائے میں تھا۔

نسیم کے خوشگوار جھونکوں سے کنول گر رہے تھے اور سر پر پھیلی ہوئی ڈالیوں کے اندر سے چاند کی روشنی چھن چھن کر میری بیوی کے زرد اور مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑتی تھی۔ ہر طرف گہرا سکون طاری تھا۔ اس سایہ دار دھندلی

رات کو میں اس کے قریب بیٹھا ہوا اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چاروں طرف سے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔

میرے دل پر اس خوبصورت نظارہ کا بے حد اثر ہوا۔ میں آہستگی سے اپنی بیوی کے اور بھی قریب آگیا۔ اس کا ایک کمزور ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے مجھے روکنے کی کوشش نہ کی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میرا دل بھر آیا اور میں نے کہا "میں کبھی تم کو بھلا نہ سکوں گا۔"

میری بیوی زیر لب مسکرائی۔ یہ ہنسی غیر ارادی بھی تھی اور طنز کا رنگ لئے ہوئے بھی۔ اس نے میری بات کے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ بلکہ مسکراہٹ کے ذریعہ مجھے سمجھانا چاہا کہ اس کے خیال میں یہ بات ناممکن ہے اور خود اس کی بھی یہ خواہش نہیں۔

اس کی غیر حاضری میں اپنی محبت کا یقین دلانے اور اس سے محبت جتلانے کا جس قدر ارادہ کرتا، اس کے سامنے آتے ہی وہ تمام باتیں کہنے کی قوت سلب ہو جاتی اور میں ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکتا۔ اگر کوئی تم پر کسی قسم کا اعتراض کرے تو بحث کرنا سہل ہے۔ لیکن اگر کوئی تمہارا مذاق اڑائے۔ تو شاید تم ایک لفظ بھی نہ کہہ سکو گے۔

ہر قسم کا مسلسل علاج کرنے سے میری بیوی کی صحت میں کوئی خاص اصلاح نہ ہوئی۔ ڈاکٹر نے تبدیلی آب و ہوا کی صلاح دی اس لئے میں اسے یہاں الہ آباد میں لے آیا۔

* * * * * *

(۳)

یہاں تک بیان کر کے دکھن بابو اچانک رک گئے اور کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ ایک متجسس نگاہ انہوں نے مجھ پر ڈالی۔ اور پھر کچھ تھکاوٹ اور افسردگی سے انہوں نے اپنے کو دونوں ہتھیلیوں پر ٹیک لیا۔ طاق پر رکھا ہوا چراغ پھر دھیما ہو چلا تھا۔ اور رات کے گہرے سناٹے میں جھینگروں کی جھنجھناہٹ زیادہ سنائی دینے لگی تھی۔

یکایک دکھن بابو نے مہر سکوت توڑی اور کہانی کا سلسلہ شروع کیا۔

"ڈاکٹر ہرن، میری بیوی کے معالج تھے کچھ دنوں کے بعد ہی انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اس بیماری نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے جس میں شفا کی امید بالکل نہیں۔ شاید اس کی تکلیفوں کا خاتمہ اس کی زندگی کے خاتمہ کے ساتھ ہی ہو۔

ایک دن میری بیوی نے مجھ سے کہا "جب بیماری میرا پیچھا چھوڑنا نہیں چاہتی اور پھر میری صحت کی چنداں امید نہیں۔ موت بھی مجھ سے بھاگا چاہتی ہے تو پھر ایسی حالت میں تم کیوں اپنے دن ایک مردہ کے ساتھ بسر کر رہے ہو؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ مجھے میری حالت پر چھوڑ کر تم اپنے دوسرے کاموں کی طرف رجوع کر دو"

میں نے کسی رومان کے ہیرو کا انداز اختیار کر کے کہنا شروع کیا۔

"جب تک میرے جسم میں جان ہے ......"

مگر اس نے فوراً روک دیا اور بولی "کچھ زیادہ کہنے کی حاجت نہیں"

"آخر کیوں؟ یہ بھی کوئی بات ہے؟"

مجھے خبر نہیں اس وقت میری فطرت نے یہ بات بانی تھی یا نہیں لیکن اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ واقعی میں اُس کی خدمت سے عاجز آ گیا تھا اور خصوصاً اس مریضہ کی خدمت سے جسے شفا کی کوئی بھی امید نہ تھی۔

صاف دکھائی دیتا تھا کہ اب اس نے میری دلی تھکاوٹ کا بخوبی اندازہ کر لیا ہے۔ اس وقت اگرچہ میں سمجھ نہ سکا تاہم اب مجھ کو ذرا بھی شک نہیں کہ اس نے میری کیفیت کو ان آسان جملوں کی طرح پڑھ لیا تھا جو بچوں کی پہلی کتاب میں ہوا کرتے ہیں یعنی مشکل الفاظ سے یکسر خالی۔

ڈاکٹر ہرن میرے ذاتی بھائی تھے۔ اس کے علاوہ میرا اُن کے گھر سے ایک قدیم تعلق تھا۔ میری آمد و رفت شروع ہونے کے کچھ روز بعد انہوں نے اپنی لڑکی سے میری ملاقات کرا دی۔ اگرچہ اس کی عمر پندرہ سولہ سال کی تھی لیکن وہ نہایت ہی ذہین اور سمجھدار معلوم ہوتی تھی۔ ابھی وہ کنواری تھی۔ اس کے والد کہتے تھے کہ انہیں کوئی لائق لڑکا نہیں ملا۔ اس لئے اس کی شادی میں دیر ہو رہی ہے لیکن باہر یہ افواہ تھی کہ اس کے جنم میں کچھ نحوست پائی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی شادی اب تک نہیں ہو سکی۔

لیکن بظاہر کوئی عیب اس میں دکھائی نہ دیتا تھا وہ جس قدر تعلیمیافتہ اور دانشمند تھی۔ اسی قدر خوبصورت بھی تھی۔ اکثر میں اس سے ہر قسم کے معاملات پر بحث کیا کرتا تھا اور دیر تک تعلیم وغیرہ کے بارے میں گفتگو کرتا۔ اسی وجہ سے کبھی کبھی میری واپسی میں بہت دیر ہو جایا کرتی۔ اور اکثر اوقات اتنی دیر ہو جاتی۔ کہ مریضہ کو دوا پلانے کا وقت بھی گزر جاتا۔ آ سے

خوب معلوم تھا کہ میں ڈاکٹر ہرن کے یہاں جاتا ہوں. لیکن پھر بھی اس نے کبھی میرے دیر سے آنے کی وجہ دریافت نہ کی۔

(۴)

مریضہ کا کمرہ اب میرے لئے ایک ناقابل برداشت جگہ تھی یہاں میرے لئے ذرہ بھر دلچسپی نہ رہی تھی اور میں اُسے ٹھیک وقت پر دوا دینے میں بھی غفلت کرنے لگا تھا. اکثر تو میں بالکل بھول جاتا. کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب مجھ سے کہا کرتے "وہ بیمار جو کہ ایک نہ ختم ہونے والے دکھ کی ناقابل برداشت تکلیف اٹھا رہے ہوں ان کے آرام کا ذریعہ صرف موت ہے اور بس. کیونکہ جب تک اُن کی زندگی ہے انہیں کسی قسم کی مسرت حاصل نہیں ہو سکتی. بلکہ زندگی دوسروں کے لئے ایک بارِ گراں ہو جاتی ہے"

کسی دوسرے مریض کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے تو وہ ایک حد تک سمجھنے کے قابل ہو سکتے تھے لیکن میری بیوی کی مثال میرے پیش نظر رکھتے ہوئے انہیں ایسا کہنا لازم نہ تھا۔

ایک روز میں اپنی بیوی کو ڈاکٹر سے یہ کہتے ہوئے سنا "ڈاکٹر صاحب آخر کیوں آپ مجھے بے فائدہ اتنی دوائیں دیئے جا رہے ہیں جبکہ میری زندگی بجائے خود ایک مرض بن گئی ہے. کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ صحتیابی کی کوشش کے بجائے میری دکھ سے بھری زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

"تمہیں ایسا نہ کہنا چاہیئے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

ڈاکٹر کے جاتے ہی میں کمرے میں داخل ہوا. اُس کے سرہانے بیٹھ کر میں نے

اس کی پیشانی کو آہستہ آہستہ سہلایا۔ اس نے کہا، "کمرہ بہت گرم ہے۔ تم تھوڑی دیر کے لئے شام کی ہواخوری کو باہر چلے جاؤ۔ اس کمرے میں بیٹھے رہے تو رات کو کھانا بھی نہ کھایا جائے گا۔"

شام کی ہواخوری کا مطلب ڈاکٹر ہرن کے ہاں جانا تھا۔ میں نے کئی روز پہلے خود بھی اُسے سمجھا دیا تھا کہ صحت اور بھوک کے لئے کس قدر ہواخوری کی ضرورت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ میرے بہانے کو وہ خوب سمجھ لیتی تھی لیکن میں اب تک سمجھا ہوا تھا کہ وہ دھوکے میں ہے اور یہ میری بیوقوفی تھی۔

یہاں تک بیان کرنے کے بعد دکھی بابو رک گئے۔ ایک اس طرح کی سرد آہ کھینچی۔ گویا ان کا دل صدمہ سے بھرا ہوا تھا۔ ذرا دیر وہ چپ رہے۔ پھر کہا۔

"مہربانی سے مجھے ایک گلاس پانی لادو۔ میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔"

پانی پینے کے بعد انہوں نے اپنا قصہ پھر بیان کرنا شروع کیا۔

ایک روز ڈاکٹر کی لڑکی منورما نے میری بیوی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نہیں کہہ سکتا کیوں، کچھ بھی ہو، لیکن مجھے اس کی درخواست پسند نہ آئی۔ تاہم کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اُسے روکتا۔ آخر کار وہ ایک روز میرے گھر پر آ ہی گئی۔

اتفاق کی بات ہے کہ اس روز میری بیوی کی تکلیف میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا اور وہ معمول سے زیادہ بے چین نظر آتی۔ جب اس کی بیماری بڑھ جاتی تو وہ بالکل خاموش لیٹ جایا کرتی تھی اور اکثر تکلیف کی وجہ سے زور سے مٹھیاں بند کر لیتی جو کوئی بھی اس وقت اُسے دیکھتا آسانی سے سمجھ سکتا کہ وہ کتنے سخت درد میں

مبتلا ہے۔

کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا اور میں چپ چاپ اس کے سرہانے بیٹھا تھا اس نے ہوا خوری کے لئے مجھے باہر جانے پر مجبور کیا۔ غالباً اس کی کمزوری نے اُسے کچھ کہنے کی اجازت نہ دی ہو گی یا وہ اپنی انتہائی تکلیف میں مجھے قریب پا کر سکون پا رہی ہو گی۔ اس وقت لیمپ دروازے کے پاس رکھا ہوا تھا۔ جسے میں نے بالکل دھیما کر دیا تھا۔ اس خیال سے کہیں مریضہ کو تکلیف نہ ہو۔ اس لئے کمرہ ذرا اندھیرا معلوم ہوتا تھا۔ صرف ایک ہی آواز رہ رہ کر سنائی دیتی تھی اور وہ میری بیوی کے کراہنے اور آہ بھرنے کی آواز تھی جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ انتہائی تکلیف میں مبتلا ہے یہی وہ وقت تھا کہ منورما آئی دروازے پر کھڑی تھی۔ لیمپ ٹھیک اس کے مقابل تھا جس سے اس کی روشنی اچھی طرح اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

میری بیوی نے انتہائی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اور میرا ہاتھ اپنے ایک ہاتھ میں لے کر پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

اپنی کمزور و ناتواں حالت میں ایک اجنبی عورت کو یوں دروازے پر کھڑا دیکھ کر متعجب ہونے کے علاوہ وہ مبہوت سی ہو گئی۔ اس نے کئی بار پوچھا "وہ کون ہے؟ وہ کون ہے۔ آخر کچھ تو بتاؤ کہ وہ کون ہے؟"

پہلے میں نے ذرا سستی سے جواب دیا! "مجھے خبر نہیں" لیکن دوسرے ہی لمحہ میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے میرے دل و دماغ کو ایک زبردست دھکا دیا۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو مستعد کر کے کہا "کیوں تمہیں خبر نہیں۔ یہ ہمارے

ڈاکٹر کی صاحبزادی ہیں۔

میری بیوی نے گھوم کر میری طرف دیکھا مجھے ہمت نہ پڑتی تھی کہ اُس سے آنکھیں چار کرتا وہ یکایک اجنبی عورت کی طرف مڑی۔

"اندر آجاؤ"۔ اس نے نہایت کمزور آواز سے کہا۔ پھر اس نے مجھ سے روشنی قریب لانے کی درخواست کی۔

منورما کمرے میں داخل ہوئی۔ اور مختصر دو چار باتیں میری بیوی سے کہیں۔ ابھی بات کا جواب دینے نہ پائی تھی کہ ڈاکٹر بھی آگیا۔ وہ اپنے ساتھ دوائی کی دو بوتلیں لے کر آیا تھا۔ میری بیوی کی طرف دیکھ کر اس نے کہا: "دیکھو یہ نیلی بوتل والی دوا باہر مالش کے لئے ہے۔ اور دوسری دو پینے کی ہے۔ ہوشیاری سے استعمال کرنا۔ ایسا نہ ہو غلطی ہو جائے کیونکہ یہ مالش کی دوا زہر ہے۔"

مجھے بھی ساتھ ہی خبردار کرتے ہوئے انہوں نے دونوں شیشیاں پاس ہی میز کے اوپر رکھ دیں۔ اور چلتے ہوئے انہوں نے اپنی لڑکی کو آواز دی۔

"میں کیوں نہ یہاں ٹھہر جاؤں پتاجی؟" منورما نے پوچھا۔ "بیمار کی خدمت کو تو کوئی خادمہ بھی نہیں ہے۔"

میری بیوی یہ سن کر سخت مترددّ ہو گئی۔ اور یکایک یہ کہتی ہوئی اٹھ بیٹھی "نہیں نہیں! تمہارے تکلیف کرنے کی حاجت نہیں میرے پاس ایک بوڑھی خادمہ ہے جو ماں کی طرح بھلا دی ہے میری خدمت کرتی ہے۔"

ڈاکٹر جیسے ہی لڑکی کے ساتھ جانے کو تیار ہوا۔ میری بیوی بول اُٹھی

سے مخاطب ہوئی: "ڈاکٹر جی! یہ بہت دیر سے اس بند کمرے میں بیٹھے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ ان کو بھی تھوڑی دیر کے لیے باہر کی تازہ ہوا میں لے جائیں۔"

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا۔

"آجاؤ۔" اس نے کہا۔ "میں تمہیں دریا کے کنارے سیر کرا لاؤں گا۔"

ایک دو بار انکار کر کے آخر میں راضی ہو گیا۔

شب کا کھانا میں نے ڈاکٹر صاحب کے ہاں کھایا اور بدستور میری واپسی میں کافی دیر ہو گئی۔ میں نے آکر دیکھا کہ میری بیوی کسی غیر معمولی تکلیف میں مبتلا ہے۔ سخت ندامت محسوس کرتے ہوئے میں نے دریافت کیا۔

"تمہاری طبیعت زیادہ خراب معلوم ہو رہی ہے کیا درد میں اضافہ ہو گیا ہے؟"

لیکن اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ جواب دیتی۔ میں نے دیکھا وہ صرف میرے منہ کو تک رہی تھی۔ سانس لینا بھی اس کے لیے مشکل تھا۔

میں نے ڈاکٹر کے لئے آدمی دوڑایا۔

پہلے ڈاکٹر فیصلہ نہ کر سکا کہ اس نئی تکلیف کا سبب کیا ہے۔ آخر کار اس نے پوچھا: "درد بڑھ گیا ہے کیا تم نے وہ دوا استعمال نہیں کی؟"

یہ کہتے ہوئے اس نے نیلے رنگ کی شیشی اپنے ہاتھ میں اٹھائی۔ وہ خالی تھی۔

انتہائی تردد کے ساتھ اس نے پوچھا۔

"کہیں غلطی سے تم نے یہ دوا تو نہیں پی لی ؟"

خاموشی سے مریضہ نے سر ہلا کر اشارے اثبات میں جواب دیا۔

ڈاکٹر اسی وقت لیمپ اور آلات لانے کو اپنے مکان کی طرف دوڑا

اور میں بے حس ہو کر بچھونے پر گر پڑا۔

ایک سچا دوست جس طرح اپنے مایوس ساتھی کو تسکین دینے کی کوشش

کرتا ہے۔ اسی طرح میری بیوی نے اپنے سینے کے قریب میرا سر آہستگی سے کھینچ کر

نہایت نرمی سے اس پر ہاتھ پھیرا اور محبت بھرے لہجہ میں کہا۔

"میرے مالک افسوس نہ کرو۔ ہر کام میں جو کچھ ہوتا ہے کچھ نہ کچھ بھلائی ہی

پیدا ہوتی ہے۔ میرے بعد تم ضرور خوش ہو گے اور یہی خیال کرتے ہوئے میں

اطمینان سے دم توڑ رہی ہوں !"

اسی وقت ڈاکٹر واپس آ گیا۔ لیکن میری بیوی کی زندگی ختم ہو چکی تھی

وہ جانبر نہ ہو سکی اور آخر کار چند منٹوں میں اس کی تکلیف کا خاتمہ اس

کی جان کے ساتھ ہو گیا۔

(۵)

دکھن بابو نے پھر ایک بار پانی پیا

"آہ !" انہوں نے کہا۔ "گرمی بے حد ہے" یہ کہتے ہوئے وہ ایک دفعہ

برآمدے میں نکل گئے۔ اور تھوڑی دیر ادھر اُدھر ٹہلتے رہے۔ اس کے بعد پھر

اندر آ گئے اور اپنی جگہ پر بیٹھ کر باقی داستان بیان کرنی شروع کی۔ اگرچہ صاف

دکھائی دے رہا تھا کہ جو کچھ انہوں نے اب تک کہا ہے ارادے سے کہا ہے۔

اور اب کچھ زیادہ کہنا بھی مناسب نہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی جادو یا غیر معمولی طاقت ان کی زبان پر قصہ بیان کرا رہی ہے۔

کہنے لگے۔ منور ما کے ساتھ میری شادی ہونے کے بعد جب کبھی میں اس سے جوش و خروش اور بے تکلفی سے باتیں کرنے کی خواہش کرتا، تو وہ بہت ہی سنجیدہ نظر آتی۔ میں نے غور کیا، کہ اس کے دماغ میں کچھ ایسے پر اسرار شکوک میری طرف سے جگہ لیے ہوئے ہیں۔ جن کو میں اب تک سمجھ نہ سکا تھا۔

ان دنوں مجھے آہستہ آہستہ شراب پینے کی عادت پڑ گئی۔

موسم خزاں کے آغاز میں ایک شام کو میں منور ما کے ساتھ دریا کے کنارے باغ میں ٹہل رہا تھا۔ رات کی تاریکی ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ ہر طرف سناٹا اور ہو کا عالم تھا۔ کسی پرندے کے پر مارنے تک کی آواز سنائی نہ دے سکتی تھی۔ ہم درختوں کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ بھی محسوس کرتے تھے جو گاہ بگاہ ہوا کے اثر سے ہلنے لگتے تھے۔

منور ما تھک کر اسی پتھر کے چبوترے پر دونوں ہاتھوں ہتھیلیوں کو سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی۔ اور میں اُس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

خوفناک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور آسمان کا وہ ٹکڑا جو ہمارے اوپر ایک سائبان کی طرح تھا۔ تاروں سے بھرا ہوا تھا۔ جھینگروں کی آواز درختوں کے جھرمٹ سے گرد و دور تک سنائی دے رہی تھی۔

میں نے تھوڑی سی شراب پی رکھی تھی۔

کچھ دیر بعد جب اس گھٹا ٹوپ اندھیرے سے ایک حد تک مانوس ہو چلا۔ اس وقت بھورے رنگ کے ڈھیلے لباس میں ملبوس منورما کی خاموش صورت نے جو درختوں کے سائے کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ میرے دماغ میں ایک کشش اور تمنا پیدا کر دی۔ وہ میری نگاہوں میں ایک ایسے پرچھائیں کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ جسے میں اپنے بازوؤں سے پکڑنے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔

یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تمام درختوں کے سرے میں کسی نے آگ لگا دی ہے۔ میں نے اوپر نظر اٹھائی۔

سنہری رنگ کا بڑا سا چاند درختوں کے پیچھے سے اُٹھتا ہوا دکھائی دیا چاند کی روشنی منورما کے چہرے پر پڑی جو کہ بھورے رنگ کے لباس میں اس چبوترے پر لیٹی ہوئی تھی اور زیادہ دیر تک اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کے بالکل قریب جا کر میں نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "منورما! شاید تم میری بات کا اعتبار نہ کرو۔ لیکن یاد رکھو کہ میں تمہاری محبت کو بھول نہ سکوں گا۔"

جیسے ہی میری زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ میں حیرت سے چونک پڑا۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے اس سے پہلے بھی کسی عورت کے روبرو یہی الفاظ استعمال کئے تھے۔ ساتھ ہی میں یہ دیکھ کر کانپ اٹھا کہ درختوں کی اونچی شاخوں پر سے چاند کی سنہری روشنی کے درمیان سے۔ دوسری طرف کھلی فضا سے ایک قہقہہ کی آواز ہمارے سر پر سے ہوتی ہوئی گزر گئی ہا ہا ہا ہا ہا!!!

یہ دل کو لرزا دینے والی آواز تھی۔ آسمان کو لرزا دینے والی پکار میں اس کی صحیح کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ اس آواز کو سنتے ہی میں زمین پر گر پڑا۔ اور پھر مجھے کچھ خبر نہ رہی۔ جب میرے ہوش و حواس درست ہوئے تو میں نے اپنے کو کمرے میں بچھونے پر لیٹا ہوا پایا۔

میری بیوی منور رانے مجھ سے دریافت کیا۔

"آج تمہیں کیا ہو گیا تھا؟"

"کیا تم نے نہیں سنا؟" میں نے خوف سے کانپتے ہوئے پوچھا۔ "اس دل ہلا دینے والے قہقہہ کی آواز کو۔ ہا ہا! ہا ہا!! جس سے تمام آسمان گونج اٹھا تھا۔"

میری بیوی ہنسنے لگی۔ "تم کس قدر ڈرپوک ہو۔ میں نے تو صرف چڑیوں کے ایک جھنڈ کو دیکھا۔ جو کہ ہمارے سر کے اوپر سے اڑتا ہوا جا رہا تھا۔"

دوسرے دن میں نے سنا کہ واقعی وہ کوئی آواز نہ تھی جو میں نے سنی تھی بلکہ راج ہنسوں کا ایک جھنڈ تھا جو موسم کی تبدیلی کی وجہ سے ایک جگہ تبدیل کرنے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہا تھا۔

لیکن شام ہوتے ہی پھر شک و شبہ نے میرے دل میں جگہ لے لی۔ مجھے معلوم ہونے لگا۔ کہ سارا آسمان قہقہہ کی آوازوں سے گونج رہا ہے جو کہ اندھیرے کو چھیدتی ہوئی آ رہی ہیں۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ شام ہونے کے بعد مجھ

میں منوہر ما سے ایک لفظ تک کہنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی۔

(۶)

آخر کار میں نے اس باغ والے مکان کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور منوہر ما کو ساتھ لے کر دریائی سفر پر روانہ ہوا۔

نومبر کی تیز اور خنک ہوا اور موسم کی خوشگواری نے میرے دل سے ایک حد تک خوف و ہراس دور کر دیا تھا۔ گزشتہ چند روز سے میں کافی مسرور رہتا۔

گنگا کو پیچھے چھوڑتے ہوئے دریائے کھوری پار ہو کر آخر کار ہم پدما میں جا پہنچے۔ یہ بھیانک دریا اپنے بازوؤں کو ایک عالی شان سانپ کی طرح پھیلائے ہوئے جاڑے کی گہری نیند میں سو رہا تھا۔ اتر کی طرف خالی بنجر زمین تھی۔ جس کے چھوٹے چھوٹے ذرّے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اور پچھم کی طرف اونچے کناروں پر آم کے درختوں کے جھنڈ اس ندی کے بالکل دہانے پر تھے۔ ہاں اس دیو ہیکل ندی کے کنارے پر جو کبھی کبھی اپنی ہیبت ناک کروٹ سے زمین کے ایک بڑے ٹکڑے کو توڑ کر اپنے اندر ملا لیتی تھی۔

ہم نے ایک آرام دہ جگہ دیکھ کر کنارے پر ہی لنگر ڈال دیا۔ ایک دن کا ذکر ہے۔ ہم ٹہلتے ہوئے اپنی کشتی سے کافی دور نکل گئے۔ غروب شدہ آفتاب کی سنہری روشنی دفعتاً رخصت ہو گئی۔ اور آسمان ماہتاب کی رو پہلی چاندنی کے سیلاب سے منور ہو گیا۔ چاند کی روشنی اس لامحدود پھیلے ہوئے

ریگستان پر چھا گئی۔ اور نیلگوں آسمان اس روشنی کے سیلاب میں اور بھی زیادہ چمک اٹھا۔

میرا دل اپنی زندگی میں ایک بار پھر درد سے بھر گیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں گویا دنیا میں تنہا ہی پیدا کئے گئے ہیں جو اس سنسان لامحدود خواب وخیال کی بستی میں بغیر کسی خواہش یا مطلب کے آوارہ گردی میں مصروف ہیں۔

منورما نے ایک سرخ شال پہن رکھی تھی۔ جس کو اس نے آہستگی سے سر پر کھینچ کر شانوں کے گرد لپیٹ لیا۔ اب صرف اس کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

سناٹا اور خاموشی اور بھی بڑھتی گئی۔ ہمارے چاروں طرف سوائے ایک زبردست سناٹے کے اور کچھ نہ تھا۔ جس میں ہلکی ہلکی روشنی ملی ہوئی تھی۔ ٹھیک اسی وقت منورما نے اپنا ایک ہاتھ آہستگی سے بڑھا کر میرے ہاتھ میں دیا۔ وہ میرے اس قدر قریب تھی کہ میں نے محسوس کیا کہ گویا اس نے اپنی جوانی اپنا دل ودماغ اور اپنا جسم اور اپنی زندگی سب کچھ میرے سپرد کر دیا ہے۔ میرے تمناؤں سے بھرے ہوئے مسرور دل میں اس کی محبت ازسرنو چٹکیاں لینے لگی۔

کیا محبت بھرے دل جو دنیا میں اس کھلے آسمان کے نیچے ایسا وسیع خطہ بھی پا سکتے ہیں۔ جہاں وہ آزادی اور مسرت سے بھر سکیں۔

اس مسرت کی گھڑی میں میرا دل بار بار یہ چاہتا تھا کہ ہم کبھی واپس نہ

جائیں بلکہ ہمیشہ اسی طرح صحرا نوردی کرتے ہوئے چلتے رہیں ایک دوسرے کے ہاتھ
میں ہاتھ ڈالے محبت بھری باتیں کرتے ہوئے ہر قسم کے تکلفات اور
فکروں سے آزاد نہ ختم ہونے والی دنیا میں چلتے چلتے ہم ایک آبشار کے
کنارے پہنچے جو کہ بالو کے ٹیلوں سے گھرا ہوا تھا۔ چاند کی ایک تیز کرن
چمکیلی تلوار کی طرح یوں شفاف پانی پر تیر رہی تھی۔ گویا وہ اُس کے
دل کو چھیدتی ہوئی گزر رہی ہو۔

اس جھرنے کے کنارے پہنچ کر ہم چپ چاپ کھڑے ہوگئے۔ اور سوزمانے
اپنی خاموش نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کا شال اس کے شانوں
سے سرک گیا تھا۔ وہ حسن کی دیوی دکھائی دیتی تھی۔ مجھ میں برداشت کی
طاقت نہ رہی۔ اور میں نے جھک کر اسکے نرم رخساروں کو بوسہ دیا۔
ٹھیک اسی وقت اس خاموش ریگستان کے کنارے سے ایک آواز دفعتاً
گھٹتی ہوئی سنائی دی۔

"وہ کون ہے؟ وہ کون ہے؟ وہ کون ہے؟"

میں چونک پڑا اور میری بیوی بھی خوف سے کانپ اٹھی۔ لیکن
دوسرے ہی لمحہ میں یقین آگیا کہ وہ کوئی انسانی آواز نہ تھی بلکہ کسی آبی
پرند کی آواز تھی۔ جو غالباً دو اجنبی انسانی آوازوں کو سُن کر اپنی نیند
سے چونک پڑا تھا۔

(۷)

ہوش وحواس کے بجا ہوتے ہی ہم فوراً واپس لوٹے۔ اور جس قدر

جلد ممکن ہو سکتا تھا۔ اپنی کشتی پر جا پہنچے۔ چونکہ رات کافی گزر چکی تھی۔
اسلئے ہم اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ اور جلد ہی بے خبر ہو گئے۔
دفعتاً گہری نیند میں میں نے دیکھا کہ تاریکی میں کوئی میرے پلنگ کے قریب
کھڑا اپنی ایک نحیف انگلی سے خواب راحت میں مصروف منورما کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے بار بار مگر نہایت آہستگی سے پوچھ رہا ہے۔
"وہ کون ہے ؟ وہ کون ہے ؟ وہ کون ہے ؟"
میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور فوراً دیا سلائی جلا کر لیمپ روشن کیا۔
دیکھا کہ مسہری ہوا سے ہل رہی ہے۔ اور ہماری کشتی ہچکولے کھا رہی ہے۔
میری رگوں میں خون جم گیا۔ اور میرے جسم پر موٹے موٹے پسینے کے قطرے
بہنے لگے۔ میں نے پھر ایک قہقہہ کی آواز سنی۔

ہا ہا ہا ہا!!! ہا ہا!!!

یہ آواز اس گہری تاریکی میں گونج رہی تھی۔ وہ دریا کی پہنائی کو طے
کرتی ریگستان کے اس پار سے گزر کر خواب راحت میں مصروف گاؤں اور شہروں
پر سے سرسراتی آ رہی تھی۔ گویا یہ ہمیشہ کے لئے کسی دوسری دنیا سے
برابر چلی آ رہی ہے۔ رفتہ رفتہ آواز کم ہوتی گئی اور ایسی کم سنائی دینے لگی۔ جیسے
ایک سوئی کی نوک کی آواز۔ میں نے اس سے پہلے کبھی ایسی دل کو چھیدنے والی
آواز نہ سنی تھی۔ یہ ایک ایسی غیر معمولی آواز تھی۔ جس کا تصور بھی میں اپنے
دماغ میں نہ لا سکتا تھا۔

اس وقت میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے دماغ میں یہ آواز اپنی جگہ پیدا

کر چکی ہے۔ اور اب کسی طرح نکل نہیں سکتی۔ خواہ وہ آواز مجھ سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو جائے آخر کار وہ آواز میرے لئے اس قدر تکلیف دہ اور ناقابل برداشت ہوگئی۔ میں نے خیال کیا کہ جب تک روشنی کو بجھا نہ دوں سو نہ سکوں گا۔ میں نے اٹھ کر روشنی بجھا دی۔ جیسے ہی میں بچھونے پر لیٹا دوبارہ مجھے معلوم ہوا کہ مسہری کے بالکل قریب اندھیرے میں کوئی آہستہ آہستہ کہہ رہا ہے۔

"وہ کون ہے؟ وہ کون ہے؟ وہ کون ہے؟"

رات کی خاموشی میں مجھے معلوم ہوا کہ میری گھڑی کی سوئی کیبن میں مسہری کی طرف اشارہ کرکے پوچھ رہی ہے۔

"وہ کون ہے؟ وہ کون ہے؟ وہ کون ہے؟"

(۸)

کہانی بیان کرتے کرتے اب دکھن بابو کے چہرہ پر عجیب زردی چھا گئی تھی اور ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ ان کے حلق میں کوئی چیز اٹک گئی ہے۔

میں نے جلدی سے ان کا شانہ ہلایا اور کہا "ذرا سا پانی پی لو"۔

اسی وقت لیمپ ایک دفعہ تیز ہو کر بجھ گیا۔ باہر صبح کی ہلکی روشنی نظر آرہی تھی۔ ایک کوا چلاتا ہوا گزر گیا۔ اور ساتھ ہی ایک زرد چڑیا کی سیٹی سنائی دی۔ راستہ پر میرے گھر کے سامنے میں نے ایک بیل گاڑی کے پہیئے کی آواز سنی۔ دکھن بابو کے چہرے پر اب تبدیلی ہو چکی تھی۔ اب اس میں خوف کے آثار نہ تھے۔

ایک خیالی دہشت کے اثر میں محصور اور شب کے سحر سے مسحور ہو کر انہوں نے اپنی کہانی بلا ارادہ مجھے سنا دی۔ اب وہ اپنی اسی حرکت پر شرمندہ نظر آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ خفگی کے آثار بھی ان کے چہرے پر نمایاں تھے وہ کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور رخصت ہونے کے بارے میں بغیر کچھ کہے نہایت عجلت کے ساتھ مکان سے نکل گئے۔

دوسرے دن آدھی رات کو میرے دروازے پر پھر مجھے وہ مخروف آواز سنائی دی۔

"ڈاکٹر! ڈاکٹر!!"

آزمائش کی رات

(۱)

میں اور شوربالا ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے میں اسی کے ساتھ پڑھتا
اور اسی کے ساتھ کھیلتا تھا۔ جب میں شوربالا کے گھر جاتا تو اس کی ماں مجھ سے
پیار کیا کرتی۔ ہم دونوں کو اپنے پاس بٹھاتی اور اپنے سامنے بیٹھا کر کہا کرتی "آہا!
کیسی اچھی جوڑی ہے" میں گو عمر میں چھوٹا تھا۔ مگر ان باتوں کو سمجھتا تھا۔ میرے
دل میں یہ خیال جم گیا تھا کہ لوگوں کی نسبت شوربالا پر میرا حق زیادہ ہے۔ سارے
محلے میں ہمارے عشق کا چرچا تھا۔ لیکن میری نظر دل میں اس کی خوبصورتی خاص
اہمیت رکھتی تھی۔ میں یہی سوچتا تھا کہ شوربالا نے میرا ہو کر رہنے کے لئے
اپنے باپ کے گھر جنم لیا ہے۔

میرے والد چودھری صاحب کے نائب تھے ان کی خواہش تھی کہ میرے
لائق ہونے پر وہ مجھے ریاست کا کام کاج سکھا کر کہیں گماشتہ بنا دیں مگر میرا ارادہ
تھا کہ اپنے گاؤں کے ستن لال کی طرح بھاگ کر کلکتہ جاؤں اور وہاں پڑھ لکھ کر

کلکٹر کا ناظر بنوں. اگر ناظر نہ بن سکوں تو کم از کم جج کا ہیڈ کلرک تو ضرور ہی بن جاؤں اسی پختہ ارادہ کو میں نے اپنے دل میں جما رکھا تھا۔

رتن لال کی مثال سے جرأت حاصل کر کے موقعہ آنے پر ایک دن میں نے کلکتہ کی راہ لی. پہلے تو کچھ دن اپنے گاؤں کے ایک آدمی کے پاس رہا. لیکن پھر والد نے حسب استطاعت میری مالی مدد کرنی شروع کر دی. پڑھنا لکھنا بھی اچھا عمدہ ہونے لگا. سکول میں پڑھنے کے علاوہ میں سماجوں میں جانے اور وہاں بھی کام کرنے لگا. اس کام میں حصہ لینے سے ذرا بھی شبہ نہ رہا کہ ملک کے لیے جان دینا بہت بڑا ایثار ہے. لیکن کس قسم کی اور کیسی ملکی خدمت کرنی چاہئے اس کا خیال تک میرے دھیان میں نہ آیا۔

ملکی خدمت کا شوق میرے دل میں خود بخود پیدا ہو گیا. میرے جوش کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا. ہماری سبھا کے ممبر لیکچر دیتے اور میں چندہ کے کاغذ لیے بغیر کچھ کھائے پیے بغیر گھر گھر چندہ مانگتا پھرتا تھا. چوراہے پر کھڑا ہو کر سبھا کے اشتہار بانٹتا اور سبھا بھون میں جا کر میز کرسی وغیرہ سجاتا تھا

(۲)

گھر چھوڑ کر میں سررشتہ دار یا ناظر بننے کے لیے کلکتہ آیا تھا. لیکن یہاں آ کر میزینی اور گیری بالڈی کو اپنا آدرش بنا لیا. اسی عرصہ میں میرے اور متھرا بالا کے والدین ہمارے بیاہ کے لیے کوشش کرنے لگے. میں کلکتہ میں پندرہ برس کی عمر میں آیا تھا. اور اب اٹھارہ برس کا تھا. والد کے نزدیک میرے بیاہ کی عمر گذری جا رہی تھی. ادھر میں دل میں عہد کر چکا تھا کہ میں ساری عمر شادی نہ کر کے

ملکی سیوا میں جان دوں گا۔ پس والد سے میں نے کہہ دیا کہ تعلیم ختم کئے بغیر میں بیاہ نہ کروں گا۔

تین مہینے کے بعد معلوم ہوا کہ شوربالا کی شادی ایک وکیل بابو رام لوچن سے ہو گئی تھی میں اپنی ماتا بھارت بھومی کے لئے چندہ جمع کرنے میں لگا ہوا تھا۔ انہیں [illegible] یہ خبر [illegible] کی حالات میں میرے دل کو چھیڑ دیتی سرسری معلوم ہوئی۔

ان دنوں میں نے ایف اے کا امتحان دینا تھا۔ والد پرلوک سدھار گئے والدہ بیچاری پیچھے رہ گئی تھیں اس لئے کالج چھوڑ کر روزگار کی تلاش میں پھرنا پڑا۔ بہت کوشش کرتے پر ایک چھوٹے سے ضلع سکول کی سیکنڈ ماسٹری ہاتھ لگی۔

میں دل میں خوش ہوا کہ چلو حسب منشا کام مل گیا میں اپنے ایدیش سے ہر [illegible] لڑکے کو زمانہ آئندہ کا لیڈر بنا دوں گا تو دیگر بالڈون یا میزینی نہ بن سکیں تو نہ سہی۔ اس سکول سے ہی میں کئی گیری بالڈی نکالوں گا۔

مگر جب میں نے کام شروع کیا تو جلدی ہی معلوم ہو گیا کہ سکول میں ہندوستان کے مستقبل کی نسبت امتحانات کی زیادہ پرواہ کی جاتی ہے اپنے شاگردوں سے اگر میں اقلیدس اور دگر میری کی باتیں چھوڑ کر ملکی امور کا ذکر کرتا ــــ تو ہیڈ ماسٹر صاحب آنکھیں دکھانے لگتے تھے۔ دو ہی مہینے میں میرا جوش سرد ہو گیا۔ اس خیال سے کہ سکول میں کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ ایک ماسٹر کو سکول میں رہنا پڑتا تھا۔ میں تھا اکیلا آدمی۔ اس لئے سکول کی حفاظت کا کام بھی میرے ہی ذمہ پڑا۔ سکول کے ساتھ والے کمرہ میں میں اکیلا ہی

رہا کرتا تھا۔ سکول ایک بڑے سے تالاب کے پاس بستی سے کچھ دور تھا۔ اس کے چاروں طرف سپاری۔ ناریل وغیرہ کے درخت تھے اور عمارت کے پاس ہی املی کے دو پیڑ تھے۔

ہمارے سکول سے تھوڑی دور سرکاری وکیل بابو رام لوچن رہتے تھے۔ میرے بچپن کی سہیلی وکیل مہاشہ کی بیوی شوربالا بھی اُن کے ساتھ تھی رام لوچن کے ساتھ میرا اٹھنا بیٹھنا ہونے لگا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ شوربالا سے میری عہد طفلی کی واقفیت سے رام لوچن باخبر ہیں یا نہیں۔ اور خود میں نے بھی مناسب نہ سمجھا کہ تھوڑے دنوں کی واقفیت پر ان سے یہ راز کھول دوں۔

پرانے واقعات کا ذکر نہ ہونے کے باعث میرے دل میں یہ خیال اب تک کم پیدا ہوتا تھا کہ کسی زمانہ میں شوربالا کا میری زندگی سے کیا تعلق تھا۔

ایک روز چھٹی کے دن میں بابو رام لوچن کے مکان پر گیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں پاس والے کمرہ میں چوڑیوں کی کھنکھناہٹ کپڑوں کی سرسراہٹ اور پازیبوں کی جھنجھناہٹ سنائی دی۔ چلمن کے ایک سوراخ سے دو آنکھیں میری طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں۔ بچپن کی سادگی اعتقاد اور محبت سے بھری ہوئی دو بڑی تیز آنکھیں پانی سے بھرے ہوئے کالے بادلوں کے اندر دو تاروں کی تاروں کی مانند میرے دل پر اثر انداز ہوئیں۔ عہد طفلی کی یاد سے مضطرب ہو کر میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ !!

گھر آیا۔ مگر دل کی تکلیف گھٹنے کی بجائے بڑھنے لگی۔ جی بہلانے کے بہت سامان کئے لیکن بے سود۔ جلن بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ...... کہ

میرا دل ایک پتھر کے بوجھ سے دبا جا رہا ہے۔ اتنے میں سورج غروب ہو گیا۔ لیکن دل کی تکلیف پھر بھی رخصت نہ ہوئی۔ تنہائی میں چپ چاپ بیٹھ کر میں نے دل سے سوال کیا "تیری شوربالا کہاں ہے؟" دل نے بھی مجھ سے یہی پوچھا کہ "تیری شوربالا کہاں گئی؟" میں نے جواب دیا "نہیں جانتا۔ تو خود اپنی خواہش سے اس کو چھوڑا تھا۔ کیا وہ میری عمر بھر راہ دیکھتی رہتی؟" دل سے پھر آواز آئی "جسے تو اس وقت صرف خواہش کرنے سے پا سکتا تھا اسے اب لاکھ سر پٹکنے پر بھی پانا تو دور رہا۔ آنکھیں بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ بچپن میں تیرے ساتھ کھیلنے والی شوربالا۔ اب تیرے پاس ہی کیوں نہ رہتی ہو۔ اس کی چوڑیوں کی جھنکار تیرے کانوں میں کیوں نہ پڑتی ہو۔ مگر یاد رکھنا اس کے اور تیرے درمیان پتھر کی دیوار حائل ہے۔

میں نے جواب دیا "دیوار ہے تو ہونے دو۔ شوربالا میری کون ہے؟" دل نے کہا "ہاں آج شوربالا سے تیرا کچھ بھی تعلق نہیں۔ مگر کسی وقت خواب ممکنا وہ تیری کیا ہو گئی ہوتی؟" میں نے جواب دیا "ہاں یہ سچ ہے کہ شوربالا میری ہو گئی ہوتی۔ وہ میری زندگی کا سکھ دکھ بانٹنے والی میری پرانیشوری بنتی۔ مگر آج وہ مجھ سے اتنی دور ہے کہ میرے لئے اس کو دیکھنا گناہ۔ اس سے بولنا عیب۔ اس کی خواہش کرنا پاپ ہے۔ رام لوچن ہمارے بیچ آکر کھڑا ہو گیا۔ یوں کہو کہ جادو کا منتر پڑھ کر وہ اسے میرے قبضہ سے لے اڑا۔

مگر خیر میں دنیا میں نئی رسموں کا واعظ بن کر نہیں آیا۔ میرا ارادہ سوسائٹی کے قواعد توڑنے کا نہیں۔ میں صرف اپنے دل کی خواہشوں کو ظاہر کر رہا ہوں۔

جتنے خیالات دل میں اٹھتے تھے وہ سب بے معنی تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شوربالا پر جو آج رام لوچن کے گھر کی رونق بڑھا رہی ہے میرا حق زیادہ ہے یا رام لوچن کا؟ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کا خیال دل میں لانا بہت بُرا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس قسم کی سوچ قدرت کے خلاف ہے شام تک میرا دل اسی ادھیڑ بن سے ہٹ کر کسی کام میں نہ لگ سکا۔ دوسرے دن دوپہر کو جب میں اپنی جماعت میں بیٹھا پڑھا رہا تھا تو میرے دل میں ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی یہ خواہش کس بات کی تھی۔ میں اس کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ سکول میں چھٹی ہوئی تو میرے لئے کمرہ میں رہنا دشوار ہو گیا۔ شام کو تالاب کے کنارہ پر ناریل اور سپاری کے پُر اسرار درختوں کی آواز سن کر میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ انسان کی ہستی دھوکے کا عالم ہے۔ اگر میں چاہتا تو شوربالا کا شوہر بن کر بڑھاپے تک آرام سے زندگی بسر کرتا۔ لیکن مجھے گری بالڈی بننے کی خواہش ہوئی۔ اور اور آخر بنا کیا؟ ایک چھوٹے سکول کا سکینڈ ماسٹر۔ افسوس!

(۳)

ایک دن بابو رام لوچن کسی مقدمہ کی پیروی کے لئے باہر گئے ہوئے تھے جس طرح میں اپنے کمرہ میں اکیلا تھا۔ اسی طرح شوربالا اپنے گھر میں اکیلی تھی صبح سے بادل آسمان پر گھر آئے تھے۔ دس بجے سے پانی برسنے لگا اس خیال سے کہ بارش زیادہ ہونے سے طلباء کو تکلیف نہ ہو ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس دن جلدی ہی چھٹی کر دی۔ بادلوں کے سیاہ ٹکڑے آسمان پر اڑتے پھر رہے تھے۔ اتنے میں زور کی جھڑی شروع ہو گئی۔ جوں جوں رات ہوئی بارش کا زور بڑھتے

لگا۔ جی میں خیال آیا کہ اس بھیانک رات کو شوربالا اپنے گھر میں اکیلی ہوگی سکول کی عمارت اس کے گھر کی نسبت زیادہ مضبوط ہے۔ بہتر ہو کہ اُسے لا کر اپنے کمرہ میں رکھوں یا خود یہ رات اسی کے گھر میں بسر کروں۔

رات کا ڈیڑھ بج گیا۔ پانی اسی شدت سے برس رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک سمندر ہے۔ جو زمین کی طرف امڈا چلا آتا ہے میں کمرہ سے باہر نکلا اور میرے قدم بے اختیار شوربالا کے مکان کی طرف چلنے لگے۔ پانی اتنا چڑھ گیا تھا کہ راستہ پر گھٹنوں تک ہو گیا۔ ایک جگہ اونچی زمین تھی میں اس پر کھڑا ہو گیا یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ اس طرف سے بھی کوئی چلا آ رہا ہے۔ اس کو دیکھ کر میرا دل رکھی نہیں سر سے پاؤں تک سارا جسم یہ سمجھ گیا کہ کون ہے۔

اب چاروں طرف پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔ ٹاپو کی مانند اکٹھی ہوئی اس زمین پر ہم دونوں ہی متنفس کھڑے تھے۔ بالکل قیامت کا سماں تھا۔ آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ اور ایک بھی تارا نظر نہ آتا تھا تاریکی رات نے بھیانک صورت اختیار کی ہوئی تھی۔ ہم دونوں میں ایک بھی لفظ منہ سے نکالنے کی طاقت نہ تھی نہ میں نے اور نہ اسی نے کوئی بات کہی۔ یہاں تک کہ ہم میں سے کسی نے آپس میں خیر و عافیت بھی نہ پوچھی۔ ہم دونوں تاریکی کی طرف نظر جمائے دیکھتے رہے۔

خیال آیا۔ آج شوربالا ساری دنیا کو چھوڑ کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی ہے بچپن سے اس وقت تک کتنا عرصہ گزر گیا اس وقت اور اس وقت کے درمیان کتنا تاریک زمانہ حائل ہے۔ اس تاریکی سے گزر کر اب شوربالا میرے پاس

ٹکرا دی ہے۔ زمانہ کی زبردست رو اس کلی کو جو کبھی میری تھی پھر ایک بار میرے پاس لے آتی۔ اگر پانی کی ایک لہر بھی چڑھ آئے۔ تو وہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دے۔

اتنے میں بارش تھمی۔ پانی ہٹا شور رہا۔ للا بغیر کچھ منہ سے کہے اپنے مکان کی طرف چلی اور میں چپ چاپ اپنے مکان کی طرف گیا۔ گھر آ کر میں سوچنے لگا۔ "میں نہ ناظر ہی سکا نہ سررشتہ دار۔" آخر کو ایک چھوٹے سے سکول کی سیکنڈ ماسٹری میرے حصہ میں آ گئی۔ مگر میری زندگی کی نہ ختم ہونے والی اندھیری رات میں ایک پل کے لیئے روشنی نمودار ہوئی۔ جس نے مجھے ایک خطرناک آزمائش میں کامیاب ہونے کی توفیق دی۔

دولت کی نذر

(۱)

برندا بن کندو سخت غصہ کی حالت میں اپنے باپ کے پاس آکر کہنے لگا۔

"میں اسی وقت آپ سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔"

اس کے والد جگن ناتھ کندو نے اظہار نفرت کے ساتھ کہا "بدبخت! ناشکرا! میں نے جو روپیہ تیرے کھانے کپڑے پر صرف کیا ہے۔ جس وقت تو اس کو ادا کرے گا تو پھر ایسی دھمکی دینا۔"

جس قسم کا کھانا جگن ناتھ کے گھر ملا کرتا تھا۔ اس پر کچھ زیادہ لاگت نہ اٹھتی تھی۔ ہندوستان کے قدیم رشی بہت کم خرچ میں ایسی چیزوں کا انتظام کر لیا کرتے تھے۔ جگن ناتھ کے طرز عمل سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس بارہ میں ان ہی کے قائم کردہ اصول پر چلنا پسند کرتا ہو اگر وہ پورے طور سے اس معیار ذہنی کو نباہنے سے قاصر رہتا تھا تو اس کی وجہ کچھ تو یہ سمجھی جا سکتی ہے کہ جس سوسائٹی میں وہ بود و باش رکھتا تھا وہ اپنے پرانے اصول سے بہت گر چکی تھی اور کچھ یہ کہ اس کی روح کو جسم کے ساتھ ملائے رکھنے کے

معاملہ میں فطرت کا تقاضا شدید وغیرہ واجب تھا۔

جب تک برنداین کنوارا تھا۔ اس کا گذارہ خاطر خواہ چلتا رہا لیکن شادی کے بعد اس نے بڑی حد تک اعلیٰ اور ارفع معیار کو جو اس کے والد بزرگوار نے قائم کر رکھا تھا ترک کرنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیاوی آسائش کے متعلق اس کے خیالات روحانیت سے مادیت کی طرف منتقل ہو رہے ہیں اور کھانے پینے کی قلت سے اُسے بھوک، پیاس، سردی، گرمی وغیرہ جو تکالیف پیش آتی ہیں۔ اس نے انہیں برداشت کرنا پسند نہ کر کے دنیا کے عام لوگوں کے طریق عمل کی تقلید شروع کر دی ہے۔

جب سے برنداین نے اپنے باپ کے قائم کردہ اعلیٰ اصول کو چھوڑا۔ تبھی سے باپ بیٹے میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس معاملہ نے انتہائی صورت اس وقت اختیار کی جب برنداین کی بیوی سخت بیمار ہوئی اور اسکے علاج کے لئے ایک کویراج طلب کیا گیا۔ یہاں تک بھی معاملہ قابل معافی تھا۔ مگر جب کویراج نے مریضہ کے لئے ایک قیمتی دوا تجویز کی تو جگن ناتھ نے سمجھ لیا کہ کویراج نالائق ہے۔ اصول وید ک سے بالکل ناواقف۔ بس اس نے فوراً اس کو مکان سے باہر نکلوا دیا۔ برنداین نے پہلے تو باپ کی منت سماجت کی کہ علاج جاری رکھا جائے۔ پھر جھگڑا بھی کیا لیکن باپ کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ آخر جب بیوی مر گئی تو برنداین کا غصہ بہت زیادہ بڑھ گیا اور اس نے اپنے باپ کو اس کا قاتل ٹھہرا دیا۔

جگن ناتھ نے حسب معمولی اس کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ اور

کہا "تم کیسی ناسمجھی کی باتیں کرتے ہو کیا لوگ ہر قسم کی دوائیں کھا کر نہیں مرتے
اگر قیمتی دوائیں ہی انسان کو زندہ رکھ سکتیں. تو بڑے بڑے راجے مہاراجے
کیوں مرتے؟ اس سے پہلے تمہاری ماں اور دادی مر چکی ہیں۔ یہ مر گئی، تو کیا
ہوا؟ وقت پر ہر شخص کو کوچ کرنا ہے"!

برندابن اگر اس قدر مغموم دملول اور صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے ناقابل نہ
ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ ان باتوں سے کچھ تسلی حاصل کر لیتا اس سے پہلے مرنے
کے وقت اس کی ماں اور دادی نے بھی دوا نہیں پی تھی اور دوا نہ پینے
کی یہ رسم قدیم سے اس خاندان میں چلی آتی تھی۔ نئی پود کا اخلاق اتنا بگڑ چکا
ہے کہ وہ پرانے طریق پر مرنا بھی پسند نہیں کرتی۔

جس زمانے کا ذکر ہم کر رہے ہیں ان دنوں انگریز ہندستان میں نئے
نئے آئے تھے۔ لیکن اس وقت بھی اس ملک کے بڑے بوڑھے اپنی اولاد کے
خلاف معمول طریقوں پر اظہار حیرت و اضطراب کیا کرتے تھے اور آخر کار
جب کچھ بن نہ آیا تو اپنے منہ لگے حقوں سے اطمینان قلب حاصل کرنے
کی کوشش کرتے تھے۔

غرض یہ کہ جس وقت معاملہ اس حد تک پہنچ گیا تو برندابن سے نہ
رہا گیا۔ اور اس نے جوش و اضطراب کے ساتھ اپنے باپ سے کہا "میں
جاتا ہوں"!

باپ نے اسے سیر دیکھ کر فوراً اجازت دے دی۔ اور اعلانیہ یہ
بھی کہہ دیا کہ چاہے دیتا میرے طریق کو ہنستا کے پر ایہ کیوں نہ سمجھیں د

میں عہد کرتا ہوں کہ تمہیں اپنی جائداد سے ایک کوڑی نہ دوں گا۔"

دوسری طرف برندابن نے بھی کہا "میں اگر تمہاری دمڑی تک کو ہاتھ لگاؤں تو اپنے آپ کو مادر کشی کا گنہگار سمجھوں گا۔"

گاؤں کے لوگوں نے طویل ہم آہنگی کے بعد اس چھوٹے سے انقلاب انگیز جھگڑے کو اطمینان کی نظر سے دیکھا۔ جگن ناتھ نے چونکہ اپنے بیٹے کو جائداد سے محروم کر دیا تھا۔ اس لیے ہر شخص اس کو تسلی دینے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ سب اس بارہ میں متفق الرائے تھے کہ محض بیوی کی خاطر باپ کے ساتھ جھگڑا کرنے کا وقت ان گئے گزرے ایام میں ہی دیکھا جا سکتا ہے اس کے متعلق وہ خود جو وجہ پیش کرتے تھے وہ بھی نہایت معقول تھی۔ یعنی وہ کہتے تھے کہ اگر کسی کی بیوی مر جائے تو بڑی آسانی سے دوسری حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن باپ مر جائے تو ساری دنیا کے مال و متاع کے عوض بھی اُسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اس میں کلام نہیں کہ اُن کی منطق ہر طرح مکمل تھی لیکن ہمیں شک ہے کہ دوسرا باپ حاصل کرنے کی دقت اس گمراہ بیٹے کو کہاں تک متاثر کر سکتی تھی بخلاف اس کے ہمارا خیال یہ ہے کہ ایسا موقعہ پیش آتا تو وہ اُسے خدائی رحم میں داخل سمجھتا۔

برندابن سے جدا ہونے کا صدمہ اُس کے باپ کو چنداں محسوس نہ ہوا جس کی بعض خاص وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے چلے جانے سے گھر کا

خرچ کم ہوگیا۔ دوسرے اس کے دل سے ایک بھاری فکر دور ہوگئی ہر وقت اسے اس بات کا خوف لگا رہتا تھا کہ میرا بیٹا مجھے زہر دے کر نہ مار دے۔ جب کبھی وہ اپنا مختصر سا کھانا کھانے لگتا تو یہی خیال اُسے بے تاب کئے دیتا تھا کہ اس میں زہر نہ ملا ہوا ہو۔ یہ فکر کافی حد تک اس کی بہو کے انتقال پر دور ہوگئی تھی۔ مگر اب وہ بالکل ہی باقی نہ رہی۔

لیکن جس طرح نہایت تاریک بادلوں میں چمکدار بجلی اور حد درجہ کے طوفانی سمندر میں بھی نہایت قیمتی رتن موجود ہوتے ہیں۔ ایسے ہی بوڑھے جگن ناتھ کے سخت دل میں ایک کمزوری باقی تھی۔ برندا بن جاتے وقت اپنے ساتھ اپنے چار سالہ بیٹے گوکل چند کو بھی لے گیا تھا۔ چونکہ اس کی خوراک اور پوشش کے اخراجات بہت کم تھے اس لئے جگن ناتھ کو اس سے بے حد محبت تھی۔ بایں ہمہ جب برندابن اُسے اپنے ہمراہ لے گیا۔ تو سب سے پہلے رنج وافسوس کے احساس کے ساتھ ہی اس نے اپنے دل میں حساب کرنا شروع کیا کہ ان دونوں کے چلے جانے سے خرچ میں کتنی کمی ہو جائے گی۔ اس بچت کی رقم سالانہ رقم کہاں تک پہنچے گی۔ اور اس بچت کو اگر کسی رقم کا سود سمجھا جائے تو اس کا اصل کتنا ہو سکتا ہے؟

جب تک گوکل چند گھر میں تھا۔ وہ اپنی شوخی اور شرارت سے جگن ناتھ کی توجہ اپنی طرف مبذول کئے رکھتا تھا لیکن اُس کے چلے جانے پر چند دن میں ہی بڈھے کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

اس سے پہلے جس وقت جگن ناتھ پوجا پاٹ میں مصروف ہوتا۔ تو گوکل چپند اُسے چھیڑا کرتا تھا۔ کھانا کھاتے وقت اس کے آگے سے روٹی یا چاول اٹھا کر بھاگ جاتا۔ اور خود کھا لیتا۔ اور جب وہ حساب لکھنے بیٹھتا۔ تو اُس کی دوات لے کر دوڑ جاتا تھا۔ مگر اب اس کے چلے جانے پر یہ سب باتیں بھی دُور ہو گئیں۔ زندگی کی روزانہ ہم آہنگی اس کے لئے بار محسوس ہونے لگی۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس قسم کا آرام آنے والی دنیا میں ہی برداشت کیا جا سکتا ہے۔ جب کبھی وہ گوکل کی شرارتوں کو یاد کرتا۔ رضائیوں میں اُس کے ہاتھوں کئے ہوئے شگافوں یا دری پر قلم دوات سے اُس کی بنائی ہوئی بھدی تصویروں کو دیکھتا۔ تو اُس کا دل مارے غم کے بیٹھ جاتا۔ جگن ناتھ کو اپنے سونے کے کمرہ میں ایک کونے کے اندر پڑی ہوئی گوکل کی دھوتی کے ٹکڑے نظر آئے تو بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے یہی وہ دھوتی تھی جسے گوکل نے دو سال کے قلیل عرصہ میں پھاڑ دیا۔ تو جگن ناتھ نے اسے جھڑکا اور بُرا بھلا کہا تھا مگر اب اس نے ان ٹکڑوں کو اٹھا کر بڑی احتیاط سے اپنے صندوق میں رکھ لیا۔ اور اس بات کا عہد کر لیا کہ اگر گوکل اس کے جیتے جی پھر کبھی واپس آ گیا تو چاہے وہ ہر سال ایک دھوتی پھاڑے وہ اس سے کبھی ناراض نہ ہو گا۔

لیکن گوکل نے نہ واپس آنا تھا نہ آیا۔ غریب جگن ناتھ روز بروز بوڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس کا خالی گھر زیادہ سے زیادہ بھیانک اور ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔

آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اطمینان کے ساتھ گھر میں بیٹھ نہ سکتا تھا۔ دوپہر کے وقت جب گاؤں کے سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں سوئے ہوتے تو جگن ناتھ ناریل ہاتھ میں لئے گلیوں میں گھومتا نظر آتا۔ گاؤں کے لڑکے جب کبھی اُسے اپنی طرف آتا دیکھتے تو کھیل چھوڑ کر دُور فاصلہ پر کھڑے ہوتے اور اس قسم کے شعر گانے لگتے۔ جن میں ایک مقامی شاعر نے بڈھے جگن ناتھ کی کفایت شعارانہ عادات کی تعریف کی تھی۔ کوئی شخص ڈر کے مارے اس کا اصلی نام زبان پر نہ لاتا تھا۔ کہ اس روز اسے بھوکا رہنا پڑے گا۔ اسی لئے لوگوں نے اس کے کئی طرح کے نام رکھ چھوڑے تھے۔ عمر رسیدہ لوگ اسے جگن ناشن کہا کرتے تھے۔ لیکن معلوم نہیں چھوٹے لڑکے اُسے چڑیل کیوں کہتے تھے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کی جلد خشک اور بدن لہو سے خالی نظر آتا تھا۔ اور اس اعتبار سے وہ اُن ہوائی روحوں سے مشابہ سمجھا جاتا تھا

(۲)

ایک روز سہ پہر کے وقت جبکہ جگن ناتھ حسب معمول گاؤں کی گلیوں میں آم کے چھتنارے درختوں کے نیچے اپنا ناریل ہاتھ میں لئے پھرتا تھا اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا جو بظاہر اجنبی معلوم ہوتا تھا گاؤں کے لڑکوں کا سرغنہ بنا ہوا انہیں کوئی نئی شرارت سمجھا رہا ہے اس کے زبردست چلن اور اس کے خیالات کی جدت سے متاثر ہو کر سب لڑکوں نے اس بات کا عہد کر لیا تھا کہ ہر کام میں اس کے کہنے کے مطابق عمل کریں گے۔ بخلاف دوسرے لڑکوں کے وہ بڈھے جگن ناتھ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر دوڑا نہیں۔ بلکہ اسی کے پاس

جا کر چادر جھاڑنے لگا۔ معاً اس میں سے ایک زندہ چھپکلی نکل کر بڈھے کے جسم پر گری اور اس کی پیٹھ کی طرف سے نیچے اتر کر جنگل کی طرف بھاگ گئی۔ مارے خوف کے بڈھے کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ جس کو دیکھ کر باقی لڑکے بہت خوش ہوئے اور خوشی کے نعرے لگانے لگے۔ جگن ناتھ پر بڑھاپا اور گالیاں دینا بہت دوبھر گیا تھا کہ وہ صافہ جو اس کے کندھے پر پڑا رہا کرتا تھا۔ غائب ہو گیا۔ اور دوسرے لمحہ میں اس اجنبی لڑکے کے سر پر پگڑی کی صورت میں بندھا ہوا نظر آیا۔

لڑکے کی طرف سے اس قسم کا سلوک دیکھ کر جگن ناتھ پہلے تو کسی قدر آزردہ ہوا۔ پھر وہ گاؤں کی روزانہ ہم آہنگی کو اس طرح شکست ہوتے دیکھ کر خوش بھی ہوا۔ عرصہ دراز سے لڑکے اس کی صورت دیکھ کر ہی بھاگ جایا کرتے تھے اور اسے ان سے بولنے اور گفتگو کرنے کا موقعہ پیش نہ آتا تھا۔ اجنبی لڑکا اس شرارت کے بعد پرے بھاگ گیا تھا مگر بہت سے وعدوں اور دلاسوں کے بعد آخر وہ اس کے پاس آیا اور دونوں میں حسب ذیل گفتگو ہونے لگی۔

"بیٹا تمہارا نام کیا ہے ؟"

"نتی پال"

"گھر کہاں ہے ؟"

"میں نہیں بتاؤں گا"

"کیوں نہیں بتاؤ گے ؟"

"میں گھر سے بھاگ کر آیا ہوں"

"بھاگے کیوں تھے؟"

"میرا باپ مجھے سکول جانے کو کہتا تھا۔"

جگن ناتھ کے دل میں خیال آیا۔ ایسے ہونہار لڑکے کو سکول بھیجنا کتنی فضول بات ہے اور وہ کیسا ناعاقبت اندیش باپ ہوگا جو اسے سکول بھیجنا چاہتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ کہنے لگا۔ "اچھا تم میرے ہاں رہنا پسند کرو گے؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں۔" اور اسی دن سے وہ اس کے گھر میں رہنے لگا۔ اسے اس گھر میں داخل ہونے سے اتنا بھی تامل نہیں ہوا۔ جتنا تاریکی میں کسی درخت کے نیچے جانے سے ہو سکتا ہے نہ صرف یہ بلکہ اس نے اپنے کھانے کپڑے کے متعلق ایسے بے تکلف طریقہ پر سوال کرنے شروع کئے۔ گویا وہ بر سوں سے رہتا ہوا اپنا خرچ ادا کر چکا ہو۔ اگر کوئی چیز اس کے منشا کے مطابق نہ ہوتی تھی۔ تو وہ بڑے جوش سے جھگڑنا شروع کر دیتا تھا جگن ناتھ اپنے بیٹے کو تو ذرا دھمکا بھی لیتا تھا مگر اسے قابو میں لانا سہل نہ تھا۔ اسی کی ہر بات ماننی پڑتی تھی۔

(۳)

گاؤں کے لوگ حیران تھے کہ جگن ناتھ نے نتائی پال کو کیوں اس قدر سر پر چڑھا رکھا ہے۔ سب جانتے تھے کہ بڈھا اب چند دن نہیں تو چند ہفتوں کا مہمان ہے۔ اور وہ اس بات کو سوچ کر بہت کڑھتے تھے کہ اس کے مرنے پر اس کی جائداد کا مالک یہی لڑکا ہوگا۔ وہ اس بات پر بیحد حسد

کرنے لگے اور انہوں نے اس بات کا ارادہ کر لیا کہ اسے ضرور نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ مگر بڈھا اُس کی ایسی نگرانی کرتا تھا گویا وہ اس کی پسلی کی ہڈی تھی۔

بعض اوقات لڑکا دھمکی دے کر کہتا۔ "میں گھر چلا جاؤں گا"۔ ایسے موقعہ پر بڈھا تحریص کے طور پر کہا کرتا۔ "میں اپنی ساری جائداد تم کو ہی دوں گا"۔ لڑکا ہر چند کم عمر تھا۔ تاہم اس وعدہ کی اہمیت کو خوب سمجھتا تھا۔

گاؤں والوں سے اور کچھ نہ ہو سکا۔ تو انہوں نے اس لڑکے کے باپ کے متعلق تحقیقات شروع کی۔ اُن کو یہ سوچ کر بہت رنج ہوتا تھا کہ اسی کے والدین اس کی یاد میں مغموم ہونگے۔ لڑکا بہت شریر ہے۔ جو انہیں اس طرح چھوڑ کر بھاگ آیا۔ وہ اسے ہزار ہزار گالیاں دیتے تھے لیکن یہ سب باتیں وہ جس جوش کے ساتھ کرتے تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ انصاف نہیں بلکہ حسد سے کام لیتے ہیں۔

ایک روز بڈھے کو کسی راہگیر کی زبانی معلوم ہوا کہ داموور پال اپنے بیٹے کی تلاش میں پاس کے گاؤں اور قصبات میں پھر رہا ہے اور عنقریب اس گاؤں میں آیا چاہتا ہے۔ نتی نے جب یہ بات سُنی تو قدرتی طور پر اس کی دلی محبت نے جوش مارا۔ اور وہ بے چینی کی حالت میں دھن دولت چھوڑ کر اپنے باپ کے پاس جانے کو تیار ہو گیا۔ مگر چکن ناتھ اسے روکنے کے لئے ہر ممکن طریق پر کوشش کرتا تھا۔ چنانچہ اُس نے کہا۔

"تم اپنے باپ کے پاس جاؤ گے۔ تو وہ تمہیں پیٹے گا۔ میں تمہیں ایک

ایسی جگہ چھپا دوں گا کہ کسی کو تمہارا پتہ نہ مل سکے۔ یہاں تک کہ گاؤں والے بھی معلوم نہ کر سکیں۔"

اس سے لڑکے کے دل میں تعجب پیدا ہوا۔ اور وہ کہنے لگا۔" بابا! مجھے کہاں چھپاؤ گے؟ بھلا وہ جگہ تو مجھے دکھا دو۔"

جگن ناتھ نے جواب دیا۔" اگر وہ جگہ میں اس وقت تمہیں دکھا دوں تو لوگوں کو خبر ہو جائے گی۔ رات ہو لینے دو۔"

بچوں میں نئی اور پر اسرار جگہ دیکھنے کا شوق زبردست ہوتا ہے۔ ننتی بھی یہ بات سن کر خوش ہو گیا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ جب میرا باپ مجھے تلاش کرنے کے بعد واپس چلا جائے گا۔ تو میں شرط باندھ کر لڑکوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلا کروں گا۔ اور کوئی معلوم نہ کر سکے گا کہ میں کہاں چھپا ہوں۔ واقعی اس وقت بڑا مزا ہوگا۔ والد بھی گاؤں چھان مارے گا اور مجھے کہیں نہ پا سکے گا۔ بڑی دل لگی ہوگی۔

دوپہر کے وقت جگن ناتھ لڑکے کو تھوڑی دیر کے لئے مکان میں بند کر کے کہیں چلا گیا۔ اس کے واپس آنے پر ننتی نے اس قدر سوالات پوچھے کہ وہ دق ہو گیا۔

آخر جب رات ہوئی تو ننتی کہنے لگا۔" بابا اب تو وہ جگہ مجھ کو دکھا دو۔"

جگن ناتھ نے جواب دیا۔" ابھی رات نہیں ہوئی۔"

اس کے تھوڑی دیر بعد لڑکے نے پھر کہا۔" بابا اب رات بہت ہو گئی ہے۔ اب تو چلو۔"

جگن ناتھ نے آہستگی سے کہا: "ابھی گاؤں کے لوگ سوئے نہیں۔"
ننتی نے پھر ایک لمحہ تامل کیا اور بولا: "بابا! اس وقت تو سب لوگ سو گئے ہیں۔ آؤ اب چلیں۔"

رات بہت گزر چکی تھی۔ غریب لڑکا اتنی دیر تک کبھی نہ جاگا تھا۔ اس لئے اس کو بیدار رہنے میں بڑی دقت پیش آرہی تھی۔ آخرکار آدھی رات کے قریب جگن ناتھ لڑکے کا بازو پکڑ کر خوابیدہ گاؤں کی تاریک گلیوں میں رستہ ٹٹولتا باہر نکلا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ کبھی کبھی کوئی کتا بھونکنے لگتا تو باقی کتے بھی اس کے ساتھ مل کر بھونکنا شروع کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں ان کے قدموں کی چاپ سے کوئی پرندہ درخت کی شاخ سے بازو پھڑپھڑاتا اڑ جاتا تھا۔ ننتی بارے خوف کے کانپ رہا تھا۔ مگر جگن ناتھ نے اس کا بازو مضبوط پکڑا ہوا تھا۔

کئی کھیتوں سے گزر کر آخرکار یہ لوگ جنگل میں داخل ہوئے یہاں ایک شکستہ مندر کھڑا تھا جس میں کسی دیوتا کی مورتی نظر نہ آتی تھی۔
ننتی نے اسے دیکھ کر مایوسی کے لہجہ میں کہا: "بس یہی جگہ تھی؟"
یہ جگہ اس کے قیاس ذہنی سے بالکل مختلف تھی۔ کیونکہ اس میں کوئی اسرار موجود نہ تھا۔ جب سے وہ گھر سے بھاگا تھا۔ بارہا ایسے شکستہ مندروں میں راتیں بسر کر چکا تھا۔ تو بھی اگر وہ چوری کھیلنے کے لئے یہ جگہ عمدہ تھی یعنی ایسی کہ اس کے ساتھ کھیلنے والے لڑکے وہاں اس کا سراغ نہ چلا سکتے۔
جگن ناتھ نے فرش کے وسط سے ایک پتھر کی سل اٹھائی۔ اس کے نیچے

حیرت زدہ لڑکے کو ایک تہ خانہ نظر آیا۔ جس میں ایک مدھم سا چراغ جل رہا تھا۔ خوف اور حیرت دونوں باتیں اس کے دل پر غالب تھیں اندر ایک چوڑی سیڑھی کھڑی تھی۔ جگن ناتھ نیچے اترا۔ اور ننھی بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

نیچے اتر کر لڑکے نے ادھر ادھر دیکھا۔ تو اسے ہر طرف پیتل کے مٹکے پڑے ہوئے نظر آئے۔ ان کے وسط میں ایک آسن بچھا تھا اور سامنے تھوڑا سیندور گھسا ہوا صندل، چند ایک جنگلی پھول اور پوجا کا باقی سامان رکھا تھا۔ لڑکے نے رفع استعجاب کے لئے ان مٹکوں میں سے بعض کے اندر ہاتھ ڈالا اور باہر نکال کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ ان میں روپے اور سونے کی مہریں بھری ہیں۔ اتنے میں جگن ناتھ نے ننھی سے کہا، "ننھی میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اپنی ساری دولت تمہیں دے دوں گا۔ میرے پاس بہت زیادہ روپیہ نہیں ہے۔ مگر جو کچھ بھی ہے۔ وہ ان مٹکوں کے اندر بھرا ہے۔ اور یہ سب میں آج تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔"

ننھی مارے خوشی کے اچھل پڑا۔ اور بولا "سب! تم ان میں سے ایک روپیہ بھی اپنے پاس نہ رکھو گے؟"

بڈھے نے جواب دیا۔ "اگر میں اس میں سے کچھ لوں تو بھگوان کرے میرا وہ ہاتھ جذامی ہو جائے۔ لیکن یہ دولت میں تمہیں ایک شرط پر دیتا ہوں اگر کبھی میرا پوتا گوکل چند یا اس کا بیٹا یا اس کا پوتا پڑپوتا۔ یا اس کی اولاد سے کوئی شخص اس راہ سے گزرے تو تمہیں لازم ہو گا کہ یہ ساری دولت ایک ایک

روپیہ اور مہر تک اس کے حوالے کر دو۔"
لڑکے نے تھوڑی دیر غور کیا اور سوچا کہ بڈھا پاگل ہو گیا ہے پھر کہنے لگا
بہت اچھا میں ایسا ہی کروں گا۔"
جگن ناتھ نے کہا "بس تو اس جگہ پر بیٹھ جا۔"
"کیوں ؟"
"تمہاری پوجا کی جائے گی۔"
لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا "پوجا کس لئے ؟"
بڈھے نے جواب دیا "یہی قاعدہ ہے۔"
لڑکا طوعاً و کرہاً آسن پر بیٹھ گیا۔ جگن ناتھ نے اس کے ماتھے پر صندل لگایا۔ بھوؤں کے بیچ میں سیندور کی بندی لگا دی۔ جنگلی پھولوں کا ہار اس کے گلے میں ڈالا۔ اور کچھ منتر پڑھنے لگا۔
بے چارا نتئی دیوتا کی طرح آسن پر بیٹھ کر منتر سنتا سنتا عاجز آ گیا۔ اس کے پپوٹے نیند سے بھاری ہو رہے تھے آخر اس نے گھبرا کر کہا :-
"بابا ......"
مگر جگن ناتھ جواب دیئے بغیر منتر پڑھتا چلا گیا۔
آخر کار منتروں کا سلسلہ ختم ہوا۔ اور بڈھے نے بڑی مشکل سے ایک گھڑے کو کھینچ کر لڑکے کے روبرو رکھا۔ اور یہ الفاظ مجبوراً اس کی زبان سے کہلوائے "میں صدق دل سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس سارے خزانہ کو گوکل چند کنڈو یا ہرنداین کنڈو ولد جگن ناتھ کنڈو یا گوکل چند کنڈو کے بیٹے، پوتے

پڑ پوتے یا اس کی اولاد کے کسی شخص کو جو اس کا جائز اور واجب جانشین ہوگا۔ دے دوں گا ؛

بار بار ان الفاظ کے کہنے میں غریب لڑکے کے ہوش و حواس جاتے رہے اور زبان خشک ہونے لگی۔

آخر یہ رسم ختم ہوئی تو غار کی ہوا چراغ کے دھوئیں اور ان دونوں کے سانس کی وجہ سے کثیف معلوم ہوتی تھی۔ لڑکے کو اپنا حلق مٹی کی طرح خشک اور ہاتھ پاؤں جلتے محسوس ہو رہے تھے بیچارے کا دم گھٹا جاتا تھا۔

چراغ رفتہ رفتہ مدھم ہوتا گیا۔ حتٰی کہ ایک آخری بھکورا لے کر گل ہو گیا۔ اس کے بعد تاریکی۔ ننھے کو ایسا معلوم ہوا کہ بڈھا جلد جلد سیڑھی کے اوپر چڑھ رہا ہے۔ اس نے گھبرا کر پوچھا "بابا تم کہاں جا رہے ہو ؟"

جگن ناتھ نے بدستور اوپر کی طرف چڑھتے ہوئے جواب دیا۔

" میں اب جاتا ہوں۔ تم یہاں رہو۔ یہاں تمہیں کوئی ڈھونڈ نہ سکے گا۔ برندا بن کے بیٹے اور جگن ناتھ کے پوتے گوکل چند کا نام یاد رکھنا ؛

اس کے بعد اس نے اوپر جا کر سیڑھی کھینچ لی۔ لڑکے نے گھٹی ہوئی دردناک آواز میں کہا "میں اب اپنے باپ کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ یہاں مجھے ڈر لگتا ہے !

جگن ناتھ نے اس کی پروا نہ کرتے ہوئے غار کے دہانہ پر پتھر کی سل رکھ دی۔ اس کے بعد دو زانو ہو کر اپنا کان پتھر کے قریب لگا کر سننے لگا۔ اندر سے آواز آئی۔ بابا جی! بابا جی! پھر کسی بھاری چیز کے فرش پر گرنے کی

آواز سنائی دی، اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔۔۔!

اس طرح اپنی دولت اس کے حوالے کرکے جگن ناتھ نے جلد جلد پتھر کے اوپر مٹی ڈالنی شروع کر دی۔ اس پر اس نے شکستہ اینٹیں اور چونا رکھ دیا اور پھر مٹی بچھا کر اس میں جنگلی گھاس اور بوٹیوں کی جڑیں گاڑ دیں۔

رات تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ مگر وہ اس جگہ سے ہٹ کر گھر نہ جا سکتا تھا رہ رہ کر اپنا کان زمین پر لگاتا اور آواز سننے کی کوشش کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب بھی اس غار کے اندر یا زمین کی اتھاہ گہرائی سے ایک دردناک رونے کی سی آواز سنائی دے رہی ہے۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رات کے آسمان پر صرف وہی ایک آواز محیط ہے اور دنیا بھر کے لوگ اس آواز سے بیدار ہو کر بستروں میں بیٹھے اسے سننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پاگل بڈھا جوش میں آ کر اور زیادہ مٹی ڈالے جاتا تھا۔ وہ چاہتا کہ اس آواز کو دبا دے۔ لیکن اس پر بھی وہ رہ رہ کر اس کے کان میں آ رہی تھی۔ بابا جی! ہائے بابا جی!

اس نے پورے زور سے زمین پر قدم مار کر چلا کر کہا۔ "چپ رہو لوگ تمہاری آواز سن لیں گے۔"

لیکن پھر بھی اسے معلوم ہوا کہ "ہائے بابا جی! ہائے بابو!" کی آوازیں رہ رہ کر سنائی دے رہی ہیں۔

اتنے میں آفتاب نے افق مشرق سے سر نکالا۔ اور جگن ناتھ کنندہ مندر کو چھوڑ کر کھیتوں کی طرف آ گیا۔

وہاں بھی کسی نے اس کے پیچھے سے آواز دی "باپ!" گھبراہٹ کی حالت میں اس نے پیچھے پھر کر دیکھا تو اس کا بیٹا برندابن تھا۔

برنداین کہنے لگا۔ "میں نے سنا ہے۔ میرا بیٹا تمہارے گھر میں چھپا ہوا ہے۔ اسے میرے حوالے کر دو۔"

یہ سن کر بڈھے کی پتلیاں پھیل گئیں۔ منہ چوڑا ہو گیا۔ اور اس نے پیچھے مڑ کر پوچھا "کیا کہا؟ تمہارا بیٹا؟"

برنداین نے جواب دیا۔ "ہاں میرا بیٹا گوکل۔ اب اس کا نام نتئی پال ہے اور میں نے اپنا نام دامودر پال مشہور کر رکھا ہے۔ تمہاری نحوست گرد و نواح میں اتنی پھیل چکی تھی کہ مجبوراً مجھے اپنا اصلی نام بدلنا پڑا۔ ورنہ ممکن تھا۔ لوگ ہمارا نام لینے سے پرہیز کرتے۔"

بڈھے نے باہستگی دونوں ہاتھ سر کے اوپر اٹھائے۔ اس کی انگلیاں اس طرح حرکت کرنے لگیں گویا وہ ہوا میں کسی نظر نہ آنے والی شئے کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پھر وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ جب اسے ہوش آیا تو اپنے بیٹے کا بازو پکڑ کر اسے گھسیٹتا ہوا شکستہ مندر کے قریب لے گیا۔ اور پوچھنے لگا۔ "تمہیں اس کے اندر سے کسی کے روتے کی آواز سنائی دیتی ہے؟"

برنداین نے جواب دیا۔ "نہیں۔"

بڈھے نے کہا۔ "غور سے سنو۔ کوئی آواز اندر سے بابا جی! بابا جی کہتی سنائی نہیں دیتی؟"

برندابن نے پھر کان لگا کر جواب دیا۔ "نہیں"

اس سے بڈھے کی فکر بڑی حد تک دور ہو گئی۔ تاہم اس کے ساتھ ہی عقل و خرد نے بھی جواب دے دیا۔

اس دن کے بعد اس کی حالت یہ تھی کہ گاؤں میں آوارہ پھرتا اور لوگوں سے پوچھا کرتا۔ "تمہیں کسی کے رونے کی آواز تو نہیں آتی"

لوگ اس کی دیوانگی پر قہقہے لگاتے تھے۔

اس کے تقریباً چار سال بعد مگن ناتھ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ دنیا کی روشنی رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اور سانس زیادہ تکلیف سے آنے لگی تھی۔ دفعتاً وہ ہذیان کی حالت میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھائے۔ اور ہوا میں اس طرح کی حرکات کرتے ہوئے گویا کسی چیز کو ٹٹول رہا ہو کہا "میری سیڑھی کس نے اٹھا لی"

اس خوفناک قید خانہ جہاں نہ دیکھنے کے لئے روشنی اور نہ سانس لینے کے لئے ہوا تھی۔ باہر نکلنے کے لئے سیڑھی نہ پا کر وہ پھر اپنے بستر مرگ پر گر پڑا۔ اور جہاں دنیا کے دائمی آنکھ مچولی کے کھیل میں کوئی چھپنے والا پایا نہیں گیا۔ اسی طریقہ میں غائب ہو گیا۔

آخری بوسہ

(۱)

آرٹ سکول کے پروفیسر من موہن بابو گھر پر بیٹھے احباب سے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ عین اس وقت جوگیش بابو کمرے میں داخل ہوئے۔

جوگیش بابو مصور تھے۔ انہوں نے حال ہی میں سکول چھوڑا تھا۔ انہیں دیکھ کر ایک شخص نے کہا۔

"جوگیش بابو! نریندر کیا کہتا ہے۔ آپ نے سُنا؟"

جوگیش بابو نے آرام کرسی پر بیٹھ کر پہلے تو ایک لمبا سانس لیا۔ بعد ازاں بولے "کیا کہا؟"

"نریندر کہتا ہے۔ صوبہ بنگال میں اس کے پایہ کا کوئی مصوّر اس وقت نہیں ہے"۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی کل کا چھوکرا ہے۔ ہم لوگ تو جیسے آج تک گھاس چھیلتے رہے ہیں"۔ جھنجھلا کر جوگیش بابو نے کہا۔

جو لڑکا باتیں کر رہا تھا، اُس نے کہا: "صرف یہی نہیں نریندر آپ کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔"

جوگیش بابو نے لاپروائی سے کہا: "کیوں، کوئی قصور ہے؟"

"وہ کہتا ہے آپ آدرش کے خیال سے تصویر نہیں بناتے۔"

"تو کس خیال سے بناتا ہوں؟"

"روپے کی خاطر۔"

جوگیش نے ایک آنکھ بند کر کے کہا: "فضول۔" پھر جوش کی حالت میں کان کے پاس سے اپنے بے ترتیب بالوں کو درست کر کے بہت دیر خاموش بیٹھا رہا۔ چین کا جو سب سے بڑا مصور گزرا ہے۔ اس کے بال بہت بڑے تھے۔ اسی وجہ سے اس نے بھی خلاف معمول لمبے لمبے بال رکھے ہوئے تھے۔ یہ بال اس کے چہرے پر نہایت بدنما معلوم ہوتے تھے۔ کیوں کہ بچپن میں ایک مرتبہ چیچک کے حملہ سے اُس کی جان تو بچ گئی تھی — مگر چہرہ بہت مکروہ ہو گیا تھا۔ ایک تو رنگ کالا۔ دوسرے چیچک کے داغ چہرہ دیکھ کر بے ساختہ یہی گمان ہوتا تھا۔ گویا کسی نے بندوق میں چھرے بھر کر اُس کے چہرہ کو نشانہ بنایا ہو۔

کمرے میں جو لڑکے تھے۔ وہ جوگیش بابو کو غصے میں دیکھ کر سامنے ہی منہ بند کر کے ہنس رہے تھے۔

یکایک وہ ہنسی جوگیش بابو نے بھی دیکھ لی۔ غضبناک لہجہ میں بولے "تم لوگ ہنس رہے ہو کیوں؟"

ایک لڑکے نے خوشامد سے جلدی جلدی کہا۔ "نہیں جناب اگر آپ کو غصہ آئے تو ہم لوگ ہنسیں یہ کبھی ممکن ہے ؟"

"ہونہہ! میں سمجھ گیا۔ اب زیادہ چالاکی کی ضرورت نہیں۔ کیا تم لوگ یہ کہنا چاہتے ہو کہ اب تک تم سب دانت نکال کر رو رہے تھے میں ایسا بیوقوف نہیں ہوں۔" یہ کہہ کر جوگیش بابو نے آنکھ بند کر لی۔

لڑکوں نے کسی طرح ہنسی روک کر کہا۔ "چلئے ہنستے تھے تو ہنسیں کیوں ؟ نریندر کے پاگل پن کو سوچ کر ہنستے تھے۔ وہ دیکھو ماسٹر صاحب کے ساتھ نریندر بھی آرہا ہے۔"

من موہن بابو کے ساتھ ساتھ نریندر بھی کمرے میں آ گیا۔

جوگیش نے ایک بار نریندر کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھ کر من موہن بابو سے کہا۔

"مہاشے! نریندر میری نسبت کیا کہتا ہے ؟"

من موہن بابو جانتے تھے کہ ان دونوں میں لگتی ہے۔ دو پتھر جب زور سے آپس میں ٹکراتے ہیں تو آگ پیدا ہو جاتی ہے وہ سمجھ گئے کہ آج بھی کچھ نہ کچھ ہو کر ہی رہیگا۔ آہستہ آہستہ ہنستے ہوئے بولے۔ "جوگیش بابو نریندر کیا کہتا ہے ؟"

"نریندر کہتا ہے کہ میں روپے کے لئے تصویر بناتا ہوں میرا کوئی آدرش نہیں ہے۔"

من موہن بابو نے پوچھا۔ "کیوں نریندر ؟"

نریندر اب تک خاموش کھڑا تھا۔ اب کسی قدر آگے آ کر بولا۔

"ہاں کہتا ہوں۔ میری یہی رائے ہے۔"

جوگیش بابو نے منہ بنا کر کہا۔ "بڑے رائے دینے والے آئے۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ ابھی کل کا لڑکا اور اتنی بڑی باتیں۔"

من موہن بابو نے کہا۔ "جوگیش بابو جانے دیجئے۔ نریندر ابھی لڑکا ہے اور بات بھی معمولی ہے۔ اس پر بحث مباحثہ کی کیا ضرورت ہے؟"

جوگیش بابو اسی طرح جوش سے بولے۔ "لڑکا ہے! نریندر لڑکا ہے جس کے منہ پر اتنی بڑی بڑی مونچھیں! وہ اگر لڑکا ہے تو بوڑھا کون ہوگا؟ منموہن بابو آپ کیا کہتے ہیں؟"

ایک طالب علم نے کہا۔ "جناب ابھی اس سے پہلے تو آپ نے اسے کل کا چھوکرا بتایا تھا۔"

جوگیش بابو کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ بولے۔ "کب کہا؟"

"ابھی اس سے ذرا پہلے۔"

غلط سراسر غلط۔ جس کی اتنی بڑی بڑی مونچھیں ہیں میں اسے لڑکا کیوں۔ غیر ممکن ہے۔ کیا تم لوگ یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں بالکل خرد ماغ ہوں؟"

تمام لڑکے یک زبان ہو کر بول اٹھے۔ "نہیں جناب۔ ایسی بات ہم بھول کر بھی زبان سے نہیں کہہ سکتے۔"

من موہن بابو کسی طرح ہنسی کو ضبط کر کے بولے۔ "چپ چپ! گول مال نہ کرو۔"

جوگیش بابو نے کہا" ہاں نریندر! تم یہ کہتے ہو کہ صوبہ بنگال میں تمہارے پایہ کا کوئی مصور نہیں!"

نریندر نے کہا: "آپ نے کیسے جانا؟"

"تمہارے دوستوں نے کہا ہے۔"

"میں یہ نہیں کہتا، تاہم اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ میری طرح خونِ جگر کھا کر بنگال میں کوئی تصویر نہیں بناتا۔"

اس کا ثبوت؟

نریندر نے پر جوش لہجہ میں کہا: "ثبوت کی کیا حاجت ہے۔ میرا یہی خیال ہے۔"

"تمہارا خیال غلط ہے۔"

نریندر بہت کم گو تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

من موہن بابو نے اس ناخوشگوار تذکرہ کو بند کر کے کہا:۔

"نریندر اس مرتبہ نمائش کے لئے تم تصویر بناؤ گے نا؟"

نریندر نے کہا: "ارادہ تو ہے۔"

"دیکھوں گا تمہاری تصویر کیسی ہوتی ہے۔"

نریندر نے انداز عقیدت سے اس کے پاؤں کی خاک لے کر کہا۔ "جس کے گرو آپ ہیں۔ اُسے کیا فکر۔ دیکھئے گا۔ میری تصویر سب پر سبقت لے جائے گی۔"

جوگیش بابو نے کہا۔ "رام سے پہلے رامائن! پہلے تصویر بناؤ۔ پھر

دعویٰ کرنا۔

نریندر نے منہ پھیر کر جوگیش بابو کی طرف دیکھا۔ کوئی بات نہ کہی اس خاموشی اور لاپروائی نے باتوں سے کہیں زیادہ جوگیش کے دل کو تکلیف پہنچائی۔

من موہن بابو نے کہا۔ "جوگیش بابو خواہ آپ کچھ ہی کہیں مگر نریندر کو اپنی روحانی طاقت پر بڑا بھروسہ ہے میں دعوئی سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک دن بڑا نامی مصور ہوگا"

نریندر آہستہ آہستہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ایک طالب علم نے کہا۔ "ماسٹر جی! نریندر میں کسی قدر پاگل پن کی جھلک نظر آتی ہے"

من موہن بابو نے کہا۔ "ہاں یہ میں مانتا ہوں۔ جو شخص اپنے جذبات کا اظہار اچھی طرح کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اُسے عوام کسی قدر بد دماغ سمجھتے ہیں۔ تصویر میں ایک خاص قسم کی دلکشی پیدا کرنے کی اس میں غیر معمول قابلیت ہے۔ تمہیں معلوم ہے۔ نریندر نے ایک بار کیا کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نریندر کے بائیں ہاتھ کی انگلی سے خون کا فوارہ جاری ہے اور وہ بیفکری سے بیٹھا ہوا تصویر بنا رہا ہے۔ میں تو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ میرے دریافت کرنے پر جواب دیا۔ انگلی کاٹ کر دیکھ رہا تھا کہ خون کا اصلی رنگ کیا ہے۔ عجیب شخص ہے۔ تم لوگ اُسے پاگل پن کہہ سکتے ہو۔ مگر اسی پاگل پن کی وجہ سے وہ ایک دن زندہ جاوید کہلانے لگا"

جوگیش بابو ایک آنکھ بند کر کے سوچنے لگے۔ جیسے گورو ویسے چیلے دونوں کے دونوں پاگل ہیں۔

(۴)

نریندر سوچتے سوچتے مکان کی طرف چلا۔ راستے میں خلقت کا اژدہام تھا۔ کتنی ہی گاڑیاں چلی جا رہی تھیں۔ مگر ان باتوں کی طرف اس کی توجہ نہ تھی اُسے کیا فکر تھی۔ اس کا حال صرف وہی جانے۔

وہ تھوڑے عرصہ میں ہی بہت اچھا مصور ہو گیا تھا۔ اس عرصہ قلیل میں وہ اس قدر نیک نام مشہور اور ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ کہ اس کے حاسد دوستوں کو اچھا نہ معلوم ہوا۔ ان ہی میں سے ایک جوگیش بابو بھی تھے نریندر میں ایک خاص قابلیت ہے اور اس کے قلم میں ایک غیر معمولی طاقت ہے۔ جوگیش بابو دل ہی دل میں اسے خوب سمجھتے تھے مگر اوپر اوپر سے اسے ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔

اس قلیل عرصہ میں نام پیدا کرنے کا ایک خاص سبب بھی تھا اور وہ یہ کہ نریندر تصویر بنانے میں اپنی تمام قابلیت صرف کر دیتا تھا اس کی نظر صرف تصویر پر رہتی تھی۔ پیسہ کی طرف بھول کر بھی اس کا خیال نہ جاتا تھا اس کی دلی خواہش تھی کہ تصویر لاجواب ہے اس میں ہر طور خصوصیت ہو۔ قیمت خواہ کم ملے یا زیادہ، وہ اپنے تخیلات اور جذبات سے لطیف نقش و نگار اپنی تصویر میں دکھاتا تھا۔ جس وقت تصویر بنانے بیٹھتا تو ہر طرف پھیلی ہوئی کائنات کا تماشا اور اس کے سارے نقش و نگار صفحۂ دل سے

محو کر دیتا تھا۔ اور اتنا ہی نہیں وہ اپنی ہستی سے بے خبر ہو جاتا تھا وہ اس وقت
کی طرح نظر آتا تھا۔ اس وقت اپنی جان تک قربان کر دینے سے بھی شاید
اس کو دریغ نہ ہوتا۔ یہ عالم اس وقت اس کی یکسوئی کا ہوتا تھا۔ یقیناً
اسی وجہ سے اُسے یہ اعزاز حاصل ہوا تھا۔ اس کے مزاج میں سادگی تھی۔ وہ
جو بات سادگی سے کہتا لوگ اُس کو غرور اور تمکنت پر محمول کرتے تھے اس
کے سامنے کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ مگر پس پشت لوگ بدگمانی سے باز نہ آتے تھے
سب کے سب نریندر کو حواس باختہ سا پاتے تھے۔ وہ کسی کی بات کان لگا کر نہ
سنتا تھا۔ کوئی پوچھتا تھا کچھ۔ وہ کچھ اور جواب دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ
ایسا نظر آتا تھا۔ جیسے ابھی ابھی خواب دیکھ رہا تھا اور کسی نے یکایک
اس کو جگا دیا۔ اس نے شادی کی اور ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔ بیوی نہایت
خوبصورت تھی۔ مگر اُسے خانہ داری کے معاملات میں کسی قسم کی دلچسپی یا دلبستگی
نہ تھی۔ تاہم اس کا دل محبت کا بحر بے پایاں تھا۔ وہ ہر وقت اسی دُھن میں
رہتا تھا کہ مصوری میں نام حاصل کرے۔ اسی وجہ سے لوگ اُسے پاگل
سمجھتے تھے۔ کسی ہلکی چیز کو اگر پانی میں زبردستی ڈبو دو تو وہ کسی طرح نہ
ڈوبے گی ضرور اوپر تیرتی رہے گی۔ بعینہٖ یہی حال اُن لوگوں کا ہے جو اپنی
دُھن کے پکے ہوتے ہیں۔ وہ دنیاوی نشیب و فراز میں کسی طرح ڈوبنا نہیں
جانتے ان کا بے چین دل ہر وقت کام کی تکمیل میں مستغرق رہتا ہے۔

نریندر سوچتے سوچتے اپنے مکان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ دیکھا دروازے
کے پاس اس کا چار سالہ بچہ منہ میں انگلی ڈالے کسی گہری فکر میں کھڑا ہے۔

باپ کو دیکھتے ہی بچہ دوڑتا ہوا آیا، اور دونوں ہاتھوں سے نریندر کو پکڑ کر بولا
"بابو جی !"
"کیوں بیٹا ؟"
بچے نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کھینچتے ہوئے کہا "بابو جی! دیکھو ہم نے ایک سینڈک مارا ہے۔ وہ لنگڑا ہو گیا ہے"
نریندر نے بچہ کو گود میں اٹھا کر کہا "تو میں کیا کروں؟ تو بڑا پاجی ہے"
بچہ نے کہا "وہ گھر نہیں جا سکتا۔ وہ لنگڑا ہو گیا ہے۔ کیسے جائے گا۔ چلو اس کو گود میں اٹھا کر گھر پہنچا دو"
نریندر نے بچہ کو گود میں اٹھا لیا۔ اور ہنستے ہنستے گھر میں لے گیا

(۳)

ایک دن نریندر کو خیال آیا کہ اس مرتبہ نمائش میں کس قسم کی تصویر دینی چاہئیے کمرہ کی دیوار میں اس کے ہاتھ کی کتنی ہی مکمل تصویریں لگی ہوئی تھیں۔
کہیں قدرتی نظارے۔ کہیں انسانی خط و خال کے نقش و نگار اور کہیں سونے کی طرح سرسوں کے کھیت کے پاس سبزہ زار اور جنگلی دل کش مناظر کہیں وہ راستے جو سایہ دار درختوں کے نیچے سے ٹیڑھے ترچھے ہو کر ندی کے پاس جا ملے تھے۔ کہیں دھوئیں کی طرح بھوری سر بفلک پہاڑوں کی قطاریں جو تیز دھوپ میں خود بخود جھلستی جا رہی تھی، صدہا مسافر دھوپ سے جل بھن کر سایہ دار درختوں کے جھنڈوں میں پناہ گزیں۔ اسی قسم کے کتنے ہی نظارے تھے دوسری جانب کتنے ہی پرندوں کی تصویریں تھیں۔ ان سب کے جذبات

ان کے چہروں سے ہویدا تھے۔ کوئی غصہ میں بھرا ہوا۔ کوئی حالتِ فکر میں کوئی شاداں و فرحاں۔

کمرے کے شمالی حصے میں کھڑکی کے پاس ایک نامکمل تصویر لگی تھی۔ اس میں تال کے درختوں کے جھنڈ کے پاس ہمیشہ سے خاموش رہنے والے سایہ کی پناہ میں ایک طرحدار نوخیز حسینہ ندی کے سیاہ پانی میں غیر متحرک بجلی کی طرح چپ چاپ کھڑی تھی۔ اُس کے ہونٹوں اور چہرہ کی ساخت میں مصوّر نے دردِ دل کا دفتر بھر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تصویر بولنا چاہتی ہے۔ لیکن شباب کا ہالہ ابھی تک اس کے جسم پر پوری طرح رونق افروز نہ ہوا تھا۔

ان تمام تصویروں میں مصوّر کے اتنے دنوں کی امیدیں، امنگیں اور یاس پلی ہوئی تھیں۔ مگر آج ان تصویروں کے نقش و نگار اور رنگ و روغن نے نریندر کو اپنی طرف نہ کھینچا۔ اس کے دل میں بار بار یہی خیالات آنے لگے کہ اتنے دنوں اس نے صرف بچوں کا کھیل کیا ہے۔ محض صفحۂ قرطاس پر رنگ آمیزی کی ہے۔ اتنے دنوں سے اس نے جو کچھ نقش و نگار صفحۂ کاغذ پر دکھائے تھے وہ سب کسی طرح بھی اس کے دل کو اپنی طرف مائل نہ کر سکے۔ کیونکہ اس کے خیالات آج سے پہلے کی نسبت بہت بلند تھے۔ بلند بلکہ زیادہ بلند تر ہو کر وہ چنڈول کی طرح آسمان پر منڈلانا چاہتے تھے۔ اگر موسم برشگال کا سہانا دن ہو تو کیا کوئی طاقت اُسے روک سکتی ہے؟ وہ اس وقت بڑے جوش و خروش سے شوقِ پرواز میں ناحدود اطراف میں اُڑ جاتا ہے۔ ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھتا۔ اپنی پہلی حالت پر کسی طرح بھی قانع نہیں رہتا۔ نریندر کے دل میں رہ رہ کر یہی خیالات آنے لگے

تخیل اور شوق کی جھڑی سی لگ گئی۔

اس نے تہیہ کر لیا کہ اس مرتبہ ایسی تصویر بنائے گا جس سے اس کا نام زندہ جاوید ہو جائے۔ وہ اس حقیقت کو سب کے ذہن نشین کرا دینا چاہتا تھا کہ اس کے محسوسات بچپن کے محسوسات نہیں ہیں۔

میز پر سر رکھ کر نریندر اسی قسم کے خیالات کے تار و پود بکھیرنے لگا۔ وہ کیا بنائے گا؟ کس موضوع پر؟ دل پر چوٹ لگنے سے معمولی اشخاص پر بھی غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔ خیالات کے کتنے ہی مکمل اور غیر مکمل مرقعے اس کی نظروں کے سامنے سے بائیسکوپ کی تصاویر کی طرح گزر گئے۔ مگر کسی نے بھی دم بھر کے لیے اس کی توجہ کو اپنی طرف نہ کھینچا۔ سوچتے سوچتے شام کی تاریکی میں شگفتہ دل خوش کن آواز نے اس کو مسرت کا نغمہ سنایا اسی لیے نریندر چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد اسی تاریکی میں وہ اندازِ فکر سے کمرہ کے اندر پاگلوں کی طرح ٹہلنے لگا۔ مگر بے فائدہ تکلیف اور مایوسی سے نریندر کا شیشۂ دل گویا چور چور ہونے کو تھا۔ لیکن سعی عظیم کے باوجود اسے کوئی خیال نہ سوجھا۔

رات بہت جا چکی تھی۔ اماوس کی تاریکی میں آسمان پرلوک کی طرح پُر اسرار معلوم ہوتا تھا۔ نریندر وہ آزردہ مزاج اور غم رسیدہ سا اسی طرف تاکتا رہا۔

باہر سے رسوئیے نے دروازہ کھٹکھٹا کر کہا "بابو!"

چونک کر نریندر نے پوچھا "کون ہے؟"

"بابو کھانا تیار ہے۔ چلیے!"

جھنجھلاتے ہوئے نریندر نے کرخت لہجہ میں کہا، "مجھے تنگ نہ کر۔ جا میں اس وقت نہ کھاؤں گا"

اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو بحرِ فکر میں غوطہ زن کر دیا۔ دنیا میں جن کو نام و نمود حاصل کرنے کا شوق پڑ گیا ہو۔ اُن کو چین کہاں؟

(۴)

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس ہفتہ میں نریندر نے گھر سے باہر قدم نہ نکالا گھر میں بیٹھے سوچا رہتا۔ کسی نہ کسی منتر سے تو سادھنا کی دیوی اپنا جلوہ دکھائے گی۔

اس سے پیشتر کسی تصویر کے لئے خیالات مہیا کرنے میں اسے دیر نہ لگتی۔ مگر اس مرتبہ کسی طرح بھی اُسے کوئی بات نہ سوجھی۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے وہ نا امید ہوتا جاتا تھا۔ صرف یہی کیوں؟ بعض اوقات اس نے جھنجھلا کر سر کے بال نوچ لئے۔ وہ اپنے آپ کو گالیاں دیتا تھا زمین پر پیٹ کے بل پڑ کر بچوں کی طرح رویا بھی تھا لیکن بے سُود!

صبح کے وقت نریندر چپ چاپ بیٹھا تھا کہ سن موہن بابو کے دربان نے آ کر ایک خط دیا۔ اس نے دیکھا۔ ماسٹر جی نے لکھا تھا:

"عزیز نریندر!"

نمائش ہونے میں اب بہت دن باقی نہیں رہے۔ ایک ہفتہ کے اندر اگر تصویر نہ آئی تو ٹھیک نہیں۔ تم کیا کر رہے ہو؟ تمہاری تصویر کتنی بن گئی۔؟

یوگیش بابو نے تصویر کھینچ دی تھی۔ میں نے دیکھی ہے خوب ہے مگر مجھے تم سے اور بھی اچھی تصویر کی امید ہے۔ تم سے زیادہ عزیز مجھے اور کوئی نہیں آشیرباد دیتا ہوں، تم اپنے گورو کی لاج رکھ سکو۔

اس کا خیال رکھنا۔ اس نمائش میں اگر تمہاری تصویر اچھی ہوئی تو تمہاری شہرت میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ تمہاری محنت کامیاب ہو۔

"مسی موہن"

خط پڑھ کر نریندر اور بھی پریشان ہوا۔ صرف ایک ہفتہ باقی ہے اور ابھی تک اس کے دماغ میں تصویر کے متعلق کوئی خیال ہی نہیں آیا۔ افسوس اب وہ کیا کر سکے گا!

اُسے اپنی روحانی طاقت پر بہت بھروسہ تھا۔ اس وقت وہ اعتقاد بھی جاتا رہا۔ اسی حقیر طاقت پر دس آدمیوں میں سر اٹھائے پھرتا رہا ہے۔

اس نے سوچا تھا۔ زندہ جاوید ہو جاؤں گا۔ مگر وائے بدقسمتی! اپنی ناقابلیت پر نریند کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

۱۵۱

مریض کی حالت میں جیسے رات آنکھوں میں نکل جاتی ہے وہ رات اسی طرح ختم ہوئی۔

نریندر کو اس کا ذرا بھی پتہ نہ ہوا۔ ادھر وہ کئی دنوں سے تصویرخانہ میں ہی سویا تھا۔ اس کے چہرہ پر بیداری کے آثار دیکھ کر نریندر کی بیوی دوڑی دوڑی آئی۔ اور جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی "اجی بچہ کو کیا ہو گیا ہے۔

آؤ دیکھو تو!"

نریندر نے کہا "کیا ہوا؟"

لیلا نے ہانپتے ہوئے کہا" شاید..... ہیضہ! اس طرح کھڑے نہ رہو۔ بچہ بالکل مدہوش پڑا ہے۔"

نہایت بددلی سے نریندر خوابگاہ میں داخل ہوا۔

بچہ بستر سے لگا پڑا تھا۔ پلنگ کے ہر طرف اس خوفناک مرض کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ سرخ رنگ دو گھڑی میں ہی زرد ہو گیا تھا یکایک دیکھنے سے یہی معلوم ہوتا تھا جیسے بچہ زندہ نہیں۔ صرف اس کے سینے کے پاس کوئی چیز دھک دھک کر رہی تھی، اور محض اس حرکت سے زندگی کی علامات نظر آتی تھیں۔

بچہ کے سرہانے سر جھکائے نریندر کھڑا ہو گیا۔

لیلا نے کہا "اس طرح کھڑے نہ ہو۔ جاؤ ڈاکٹر کو بلا لاؤ" ماں کی آواز سن کر بچہ نے آنکھیں کھولیں۔ ڈری ہوئی آواز میں بولا۔

"ماں! او ماں!!"

"میرا لال! میری دولت! کیا کہہ رہا ہے؟" یہ کہتے کہتے لیلا نے دونوں ہاتھوں سے بچہ کو اپنی گود سے چمٹا لیا۔ ماں کی چھاتی پر سر رکھ کر بچہ پھر پڑ گیا۔

نریندر کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بچہ کی طرف دیکھتا رہا۔

لیلا نے طعن آمیز لہجہ میں کہا "ابھی تک ڈاکٹر کو بلانے نہیں گئے..؟"

نریندر نے دبی آواز سے کہا: "ایں ..... ڈاکٹر؟"
شوہر کی آواز کا غیر معمولی لہجہ سن کر لیلا نے متحیر ہو کر کہا:۔

"کیا؟"
"کچھ نہیں"

"اب جاتا ہوں"
نریندر گھر سے باہر نکلا
گھر کا دروازہ بند ہوا۔ لیلا نے حیرت زدہ ہو کر سنا کہ اس کے شوہر نے باہر سے دروازہ کی زنجیر کھینچ لی۔ سوچتی تھی یہ یہ کیا؟

( )

نریندر تصویر خانہ میں داخل ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر وہ کچھ سوچنے لگا۔ اس کی حالت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا۔ وہ کسی شدید روحانی تکلیف میں مبتلا ہے ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ صرف دیوار میں لگی ہوئی گھڑی بھی نہ تھکنے والی چال سے ٹک ٹک کر رہی تھی۔ اور نریندر کے سینہ کے اندر اس کا دل گویا جواب دیتا ہوا کہہ رہا تھا۔ دھک دھک ... ید اس کے ہیبتناک ارادوں سے واقف ہو کر گھڑی اور اس کا دل آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے۔ یکایک نریندر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بدحواسی کے سے عالم میں کہنے لگا:۔

"کیا کروں؟ ایسا آدرش اب نہ ملے گا مگر.... وہ تو میرا لڑکا ہے۔"
وہ کہتے کہتے رک گیا۔ منہ بنا کر پھر بیٹھ گیا۔ اور چپ چاپ سوچنے لگا۔
یکایک مکان کے اندر سے سنسناتے ہوئے تیر کی طرح اُن کی دل خراش آواز اس کے کانوں میں پہنچی۔

"میرے لال! تو کہاں گیا؟"

جس طرح چلہ ٹوٹ جانے سے یکایک کمان سیدھی ہو جاتی ہے۔ فکر و تشویش سے نریندر جو بہوا اسی طرح سیدھا کھڑا ہو گیا اس کے چہرے پر خون کا نشان تک نہ تھا۔ پھر کان لگا کر اس نے آواز سُنی۔ اور سمجھ گیا کہ بچہ چل بسا۔

دل ہی دل میں بولا "بھگوان تم گواہ ہو۔ میرا کوئی قصور نہیں۔"
اس کے بعد اپنے سر کے بالوں کو مٹھی میں لے کر سوچنے لگا۔ جیسے ذرا دیر کے بعد انسان نیند سے چونک اٹھتا ہے۔ اسی طرح چونک کر جلد جلد میز سے کاغذ قلم اور رنگ وغیرہ لے کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔
خوابگاہ کے سامنے ایک کھڑکی کے پاس آ کر نریندر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ سنائی دیتا ہے کیا؟ نہیں سب خاموش ہیں۔ اس کھڑکی سے کمرے کا اندرونی حصہ نظر آ رہا تھا۔ جھانک کر خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے نریندر نے دیکھا۔ اس سے اس کے تمام بدن میں گویا کانٹے چبھ گئے۔ بستر الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ بچہ سے گود خالی کئے ماں وہاں پڑی تڑپ رہی تھی۔

اور اس کے علاوہ ..... ؟ کمرے میں زمین پر لوٹتے ہوئے بچے کے مردہ جسم کو دونوں ہاتھوں سے سینہ میں دبائے لیلا بال بکھرائے آنکھیں پھاڑے بچے کے بے حس ہونٹوں کو باربار چوم رہی تھی۔

نریندر کی دونوں آنکھوں میں جیسے کسی نے دو سلاخیں چبھو دیں۔ اس نے ہونٹ چبا کر بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا اور اس کے ساتھ ہی کاغذ پر پہلا خط کھینچا۔ اس کے سامنے کمرے کے اندر یہی خوفناک نظارہ تھا۔ شاید دنیا کے کسی اور مصوّر نے ایسا نظارہ سامنے رکھ کر قلم نہ اٹھایا ہوگا۔

ظاہراً نریندر کے جسم میں کوئی حرکت نہ تھی۔ مگر اس کے دل میں کیا ہو رہا تھا؟ اسے کون سمجھ سکتا ہے وہ تو نایاب تھا۔

نریندر جلد جلد تصویر بنانے لگا۔ زندگی بھر میں اتنی جلدی تصویر بنانے میں اس نے کبھی نہ کی تھی۔ اس کی انگلیاں کسی نامعلوم طاقت سے آج سحری قوت حاصل کر چکی تھیں۔ خط و خال کے بناتے ہوئے اس نے سنا۔

"بیٹا او بیٹا! باتیں کرو۔ ذرا ایک بار دیکھ تو لو؟"

نریندر نے دبی زبان سے کہا "اُف! یہ ناقابل برداشت ہے" اور اس کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

مگر اسی وقت قلم اٹھا کر وہ پھر تصویر بنانے لگا۔ رہ رہ کر لیلا کی آہ و زاری کانوں میں پہنچ کر دل کو چھیلتی اور خون کی حرکت مسلسل کئے دیتی تھی اس کے ہونٹ بے حس بن کر قلم کی روانی کو بند کر دیتے تھے۔

اسی طرح منٹ پر منٹ گزرنے لگے۔

صدر دروازہ سے اندر آنے کے لیے نوکروں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ مگر نریندر گویا اس وقت دنیا اور دنیا کی ہر آواز کی طرف سے بہرہ ہو چکا تھا۔

وہ کچھ بھی نہ سن سکا۔ وہ اس وقت ایک مرتبہ کمرے کی طرف اور ایک بار تصویر کی طرف دیکھتا تھا۔ ایک بار رنگ میں قلم ڈبوتا۔ اور پھر کاغذ پر قلم چلاتا تھا۔

وہ باپ تھا۔ مگر کمرہ کے اندر بیوی کے سینہ سے لپٹے ہوئے مرحوم بچہ کی یاد بھی وہ رفتہ رفتہ بھولتا جا رہا تھا۔

یکایک لیلا نے اُسے دیکھ لیا۔ دوڑتی ہوئی کھڑکی کے پاس آکر دردناک لہجہ میں بول اٹھی "کیا ڈاکٹر کو بلایا؟ ذرا ایک بار آکر دیکھ تو لیتے کہ میرا لال زندہ ہے یا نہیں...... یہ کیا؟ تصویر بنا رہے ہو؟ تصویر بنا رہے ہو؟"

چونک کر نریندر نے لیلا کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکھڑا کر گر رہی تھی۔

باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے اور بار بار چلانے پر بھی جب دروازہ نہ کھلا تو رسویا اور نوکر دونوں ڈر گئے۔ وہ اپنا کام ختم کر کے روز شام کو گھر چلے جاتے تھے اور صبح کام کرنے آتے تھے ہر روز لیلا یا نریندر دونوں میں سے کوئی نہ کوئی دروازہ کھول دیتے تھے۔ آج اتنا وقت ہو گیا۔ اس قدر چلانے اور کھٹکھٹانے پر بھی دروازہ نہ کھلا۔ ادھر وہ

کرمیلا کے رونے کی آواز بھی کانوں میں آتی تھی۔

ان لوگوں نے محلہ کے چند لوگوں کو بلایا۔ آخر سب نے صلاح کر کے دروازہ توڑ ڈالا۔

سب حیرت زدہ ہو کر مکان میں گھسے۔ زینہ سے چڑھ کر دیکھا۔ کہ دیوار کا سہارا لئے دونوں ہاتھ زانو پر رکھے نریندر سر نیچا کئے بیٹھا ہے۔

اُن کے پاؤں کی آہٹ سے نریندر نے چونک کر منہ اٹھایا۔ اس کی آنکھیں خون کی طرح سُرخ تھیں۔ ذرا دیر بعد وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ اور سامنے لگی ہوئی تصویر کی جانب اُنگلی دکھا کر بول اٹھا۔

"ڈاکرٹا! ڈاکرٹا!! میں امر ہو گیا۔"

(۷)

دن گزر گئے۔ نمائش شروع ہو گئی۔

نمائش میں دیکھنے کی کتنی ہی چیزیں تھیں۔ مگر ناظرین خصوصیت کے ساتھ ایک ہی تصویر پر جھکے پڑتے تھے۔ تصویر چھوٹی سی تھی۔ اور اب بھی ناتمام تھی۔ اس کا نام تھا "آخری بوسہ!!"

بچہ کا مردہ جسم سینہ سے لگائے ماں اپنے دل کے ٹکڑے اس کے چاند جیسے چہرے کو بار بار چوم رہی تھی۔ یہی اس تصویر میں دکھایا گیا تھا۔

رنج و غم میں ڈوبی ہوئی ماں کا چہرہ، آنکھ اور جسم میں مصور نے قلم نے ایک ایسا رقت انگیز اور درد کا مرقعہ کھینچا تھا کہ جو دیکھتا تھا اسی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ تصویر کے خط و خال میں اس قدر

رقت اور درد بھرا جا سکتا ہے یہ بات اس سے پیشتر کسی کے خیال میں نہ آئی تھی۔

اس مجمع میں کتنے ہی مصور بھی تھے۔ ایک نے کہا "دیکھئے جوگیش بابو آپ کیا کہتے ہیں؟"

جوگیش بابو اس وقت چپ چاپ تصویر کی طرف دیکھ رہے تھے یکایک سوال سن کر ایک آنکھ بند کر کے بولے۔

اگر مجھے پہلے سے علم ہوتا، تو میں نریندر کو اپنا گورو بنا تا۔

ناظرین نے آفرین اور مرحبا کے نعرے بلند کرنے شروع کئے مگر کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہوا۔ کہ اس نیک آدمی کی قیمت کیا ہے؟ اگر سنتا بھی تو کسی کو یقین نہ آتا۔

مصور نے خاک ہو کر خون سے اس تصویر کو رنگا ہے۔ اس کا حال کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکا

مزدور کا بہشت

(۱)

حاصل اور لاحاصل یہ دونوں لفظ اس کے نزدیک بے معنی تھے۔ اس نے کبھی کوئی مفید کام نہ کیا تھا۔ اپنی ہی دھن میں مست رہا اور عمارتوں اور جانداروں کے چھوٹے چھوٹے بت تراشا کرتا تھا۔ وہ مصور بھی تھا۔ اسی قسم کے لاحاصل اور غیر مزدوری کاموں میں وہ اپنا وقت صرف کرتا تھا۔ دنیا اس پر ہنستی تھی۔ کبھی کبھی اپنا خبط دور کر دینے کی وہ قسم بھی کھاتا تھا لیکن اس کا مرض روز بروز بڑھتا ہی جاتا تھا۔

بعض لڑکے محنت نہ کرنے پر بھی امتحان میں پاس ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اپنا وقت اس نے فضول ہی ضائع کیا تھا۔ لیکن تعجب ہے کہ مرنے کے بعد جنت کے دروازے اس کے لئے کھل گئے۔ فرشتوں نے غلطی سے اسے مزدوروں کے بہشت میں لا کر چھوڑ دیا۔

اس بہشت میں عیش کے سوا سب کچھ تھا۔ بہشت والوں محنت کا سودائی بنا رکھا تھا۔ ان کا کوئی لمحہ بھی بیکار نہ گزرنے پاتا تھا۔

لیکن یہ نو وارد جس نے زمین پر آرام و آسائش میں زندگی بسر کی تھی مزدوروں کی بہشت میں نا اہل ثابت ہوا۔ پژمردہ دل سینہ میں چھپائے وہ تاریک کوچوں میں جمائیاں لیا کرتا تھا۔ خود سبزے پر پڑا رہتا۔ اور محنتی کسانوں سے کام لیتا تھا۔ دراصل وہ دوسروں کی راہ میں کانٹا تھا۔ ایک چنچل اور محنتی لڑکی روز ایک خاموش آبشار کے قریب جاتی۔ خاموش اس لئے کہ مزدوروں کے بہشت میں آبشار بھی رقص و سرود میں اپنی اپنی طاقت فضول ضائع نہیں کرتے۔ لڑکی اسی آبشار میں اپنی صراحی بھرنے آیا کرتی تھی۔

اس کا خرام ویسا ہی آب گردار اور باقاعدہ تھا۔ جیسے ستار کی تاروں پہ کسی کامل فن کی انگلیوں کی حرکات، بالوں کا جوڑا لاپروائی سے بندھا ہوا وہ کچھ پریشان تھی۔ نرگسی آنکھوں کی ترچھی چتوں دیکھنے کے لئے آئینہ جبیں پہ تول رہی تھی۔

وہ ناکارہ ازلی وہیں آبشار کے کنارے پر کھڑا تھا۔ جس طرح کوئی راجکماری اپنی چلمن سے کسی خوش اندام بھکاری کو دیکھ کر مہربان سی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آہو خرام جنتی دوشیزہ کا دل اس بے کار نوجوان کو دیکھ کر پسیج گیا۔

جنتی دوشیزہ نے کہا "کیوں جی کیا تمہارے پاس کوئی کام نہیں ہے۔ ہاں"

جواب ملا۔ "کام! کام کرنے کی مجھے فرصت ہی نہیں۔"

لڑکی اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ کہنے لگی۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارے

لئے کچھ کام مہیا کر سکتی ہوں۔"

اس نے کہا۔" بے زبان آبشار کی دلاری! تیرا دیا ہوا کام کرنے کے لئے میں تیرا یہاں منتظر تھا۔"

لڑکی نے پوچھا۔" تم کس قسم کا کام پسند کرو گے؟"

اس نے جواب دیا۔" گونگے جھرنے کی بیٹی۔ اپنے گھڑوں میں سے کوئی گھڑا مجھے دے دے۔"

حیرت زدہ ہو کر لڑکی نے پوچھا۔" گھڑا! تم کیا اس میں پانی بھرو گے؟"

" نہیں میں اس پر تصویر کھینچوں گا۔"

لڑکی نے بے دلی سے کہا۔" مجھے تم جیسے آدمیوں کے ساتھ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ لو میں چلی۔"

اور وہ چلی گئی۔ کاہل کی دوستی سے محنتی کو کیا حاصل ہو گا۔ ہر روز اسی جگہ وہ ملتی تھی۔ بس یہی ایک کلمہ اس کے وردِ زبان تھا۔

" بے زبان آبشار کی دلاری! مجھے اپنا کوئی خالی گھڑا دے دے میں اس پر تصویر بناؤں گا۔"

آخر وہ فتحیاب ہو گیا۔ لڑکی اسے ایک گھڑا دینے پر مجبور ہو گئی۔ اس نے گھڑے پر تصویر بنانی شروع کی۔ ایک لکیر کے بعد دوسری، اور ایک رنگ کے بعد دوسرا رنگ چڑھاتا گیا۔ جب تصویر تیار ہو گئی۔ تو لڑکی نے متحیر نگاہوں سے اسے دیکھا۔" ان لکیروں اور رنگوں سے کیا حاصل ہے؟" اس نے مزاکشانہ پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" مصور نے جواب دیا۔

"تصویر سے بھلا کوئی فائدہ ہوتا ہے۔ اس سے کچھ حاصل نہیں۔"
لڑکی نے کہا۔

لڑکی گھبرائے کر چلی گئی۔ گھر آکر اپنی متجسس نگاہوں کے آگے روشنی میں اس نے گھبرا کر رکھا۔ اور بڑے غور سے تصویر کو دیکھنے لگی۔ رات کو نیند سے جاگ کر اور بڑے تعجب سے دیا جلا کر اس نے دوبارہ وہ تصویر دیکھی۔ اپنی زندگی میں سب سے پہلی مرتبہ اس نے ایک لاحاصل اور بے فائدہ چیز دیکھی۔

(۲)

لڑکی نے اس بیکار انسان کو پھر اسی آبشار کے قریب پایا۔ حیران ہو کر اس نے کہا۔ "آخر تجھ سے تم کس قسم کا کام لینا چاہتے ہو؟"

"کہو تمہارے جوڑے کے لئے ایک رنگین فیتہ بنا ڈالوں۔"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟" لڑکی نے کہا۔

"کچھ نہیں یونہی۔" ناکارہ شخص نے کہا۔

رنگ رنگ کا چمکتا ہوا فیتہ بنایا گیا۔ اب مزدوروں کے بہشت کی مشہور دوشیزہ کے وقت کا کچھ حصہ اپنی زلفیں اس فیتے سے سجانے میں گزرنے لگا۔ اس کے اوقات فضول ضائع ہونے لگے۔ کئی آدمی جو ہمیشہ کام میں مشغول رہتے تھے۔ کاہل الوجود ہو گئے۔ اپنا وقت مصوری جیسے بیہودہ کاموں میں ضائع کرنے لگے۔ بوڑھے خرانٹ بہت فکرمند

ہوئے۔ انہوں نے ایک جلسہ کیا۔ سب نے بیک آواز کہا۔ جنت کی تاریخ میں آج تک ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔" اسی وقت دو فرشتے آپہنچے اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا کہ ایک انسان یہاں آگیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ خرابی پیدا ہوتی ہے۔

اب وہ ناکارہ آدمی طلب کیا گیا۔ سب نے اس کے لباس اور تصویروں کو دیکھا۔ پھر باتفاق یہ فیصلہ کیا کہ یہ آدمی اس بہشت میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔

صدر جلسہ نے کرخت آواز میں اُسے مخاطب کرکے کہا: "اے شخص ہماری جنت میں تیرے جیسے لوگوں کی ضرورت نہیں۔ خیریت چاہتا ہے تو چپکے سے یہاں سے چلا جا۔"

اس نے اطمینان کی سانس لی۔ تصویریں اور قلم سمیٹ کر وہ جہنم جانے لگا۔ آبشار کی وہی دل آزاری مزدوری ہوتی آئی۔ پھر دیس بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ یہ بوڑھوں نے ٹھنڈی سانس بھری کیونکہ آج تک مزدوروں کی جنت میں ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔

گھاٹ کی سرگذشت

(۱)

جس طرح فوٹو کے پلیٹ پر صورتوں کے عکس اُتر آتے ہیں۔ اسی طرح
واقعات کے نقش اگر پتھروں پر منقش ہوتے ممکن ہوتے۔ تو تم میری ایک
سیڑھی پر سے ہزارہا سال کے واقعات پڑھ سکتے تھے۔ مگر تم زمانہ گزشتہ
کی داستانیں سُننا چاہتے ہو۔ تو میری اس سیڑھی پر بیٹھ جاؤ۔ اور دریا کی
گڑگڑاہٹ پر کان لگاؤ۔ تو سالہائے قدیم کی بہت سی بھولی ہوئی
کہانیاں تمہیں سنائی دیں گی۔

آہ مجھے یاد ہے گویا کل کی سی بات ہے۔ اسوج کا مہینہ شروع
ہونے والا تھا۔ نسیم سحر کے ہلکے اور خوشگوار جھونکوں میں برائے نام خنکی
پیدا ہو چکی تھی۔ جو سحر خیز انسانوں کو نئی زندگی دے رہی تھی۔ درختوں کے
پتے کبھی کبھی بے معلوم سرسراہٹ معلوم کرتے تھے۔ دریا پوری طغیانی پر تھا
میری صرف چار سیڑھیاں پانی سے باہر تھیں۔ گویا خشکی اور پانی ہاتھ میں ہاتھ

ڈالے برابر کھڑی تھیں۔ پانی ساحل کے نشیبی حصوں میں بھی داخل ہو گیا تھا جہاں آموں کے جھنڈ کے نیچے کا چو کے پورے بہار دکھا رہے تھے دریا کے اس طرف پرانی اینٹوں کے تین تودے جزیروں کی شکل میں نمودار تھے شکاری کشتیاں کنارہ پر درخت کے تنہ سے بندھی ہوئی صبح کے جوار بھاٹے میں جھکورے لے رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پریاں جوانی کے نشہ سے مست ہو کر اٹھکیلیاں کر رہی ہیں۔ اور کشتیوں کو پیار کے تھپیڑے لگا رہی ہیں۔ ابتدائی موسم خزاں کی دھوپ دریا کے سینہ پر منعکس ہو کر کندن کی دمکتی یا چمپا کی کلیوں کی طرح چمکتی تھی۔ اور کسی موسم کی دھوپ میں یہ رنگت نظر نہیں آسکتی۔ رام رام کا جپ کرتے ہوئے ملاحوں نے کشتیوں کے لنگر اٹھا دیئے اور ان چھوٹی کشتیوں کے بادبان آفتاب سے منور پانی کی سطح پر اڑے جا رہے تھے۔ جس طرح پرندے نیلگوں آسمان میں اپنے پر پھیلائے ہوئے خوش خوش روشنی کی طرف جا رہے ہوں۔ ان کشتیوں کو آسانی کے ساتھ پرندوں کے ساتھ تشبیہہ دی جا سکتی ہے کیونکہ وہ ابابیلوں کی طرح میری چھاتی پر دوڑ رہی ہیں۔ مگر ان کے بازو ہوا میں اڑتے ہیں۔ برہمن دیوتا ٹھیک وقت پر اپنا پوجا کا سامان لئے ہوئے اشنان کرنے آ پہنچا ہے اور عورتیں دو دو تین تین کی ٹولیوں میں پانی بھرنے آ رہی ہیں۔

بہت زمانہ نہیں گزرا۔ چاہے تم اسے کتنا ہی زیادہ کہو۔ لیکن میرے نزدیک وہ حال کی سی بات ہے۔ میری عمر مدت سے لہروں کے ساتھ کھیلتے

میں بسر ہوتی ہے۔ میں صدیوں سے ان کا تماشا دیکھ رہا ہوں اور اسی وجہ سے وقت گزرتا ہوا مجھے محسوس نہیں ہوتا۔ ہر روز میرا سفید عکس دریا میں منعکس ہوتا ہے۔ اور ہر رات میرا سایہ پانی میں پڑتا ہے لیکن دوسرے دن غائب ہو جاتا ہے۔ اور اس کا کچھ نشان باقی نہیں رہتا۔ یہی سبب ہے کہ اگرچہ میں بوڑھا معلوم ہوتا ہوں۔ لیکن میرا دل جوان ہے۔ سالہا سال کے واقعات کی یاد نے مجھ پر کائی کی طرح غلبہ نہیں کیا۔ اور نہ مجھے دھوپ سے محروم کر دیا ہے۔ اور اگر کبھی کسی دوسری جگہ کائی کا کوئی چھوٹا ٹکڑا مجھے آچمٹتا ہے۔ تو ایک ہی لمحہ بعد دریا کی لہر اسے بہالے جاتی ہے۔ تاہم میں کائی سے بالکل آزاد نہیں ہوں۔ میرے بعض سوراخوں میں جہاں تک دریا کی لہر نہیں پہنچ سکتی کائی نے اپنا گھر بنا لیا ہے۔ اور وہ کہن سالی کی گواہ ہے۔ اس نے زمانہ قدیم کو مضبوطی سے باندھ رکھا ہے اور اسے ہمیشہ تازہ ہمیشہ نیا اور ہمیشہ خوشگوار بنا رکھا ہے۔ اس موسم میں ہر سال دریا مجھ سے گریز کرنے لگتا ہے۔ ہر روز ایک سیڑھی پانی سے خالی ہو جاتی ہے۔ اور ایک ایک سنگین قدم کے اعتبار سے میری عمر بڑھ جاتی ہے۔

دیکھیے وہ چکرورتی خاندان کی دادی صبح کا اشنان کر کے سردی میں ٹھٹھری بیٹ کرتی ہوئی گھر کو جا رہی ہے مگر اس بڑھیا مائی کی دادی بھی کسی زمانہ میں ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ جو ہر روز گھرت کماری کے پتے دریا میں بہا کر خوش ہوا کرتی تھی۔ اور میرے دائیں طرف دریا میں جو چھوٹا سا بھنور ہے۔ اس میں ان پتوں کو چکر کاٹتے دیکھتی رہتی تھی۔ مگر تھوڑے عرصہ بعد

وہ بچوں کی ماں بن گئی۔ اور اپنی چھوٹی لڑکی کے ساتھ پانی بھرنے آیا کرتی تھی۔ تھوڑے دن اور گزرے ہوں گے کہ وہ لڑکی بھی جوان ہو گئی۔ جوان چھوٹی لڑکیوں کو سزا دیتی اور نصیحت کیا کرتی تھی۔ جو دریا میں کلیلیں کرتی یا پانی کے چھینٹے اڑایا کرتی تھیں۔ پھر مجھے اُن کی راوی کا بچپن میں پتّوں کا دریا میں بہانا یاد آجایا کرتا تھا۔ اور مجھے بڑی ہنسی آتی تھی جو کہانی میں تمہیں سُنانا چاہتا ہوں۔ اس کا بیان کرنا مشکل ہے، کیونکہ جب میں ایک بات تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ تو فوراً ہی دوسرا واقعہ دھیان میں آجاتا ہے ایک سانحہ پیش آتا ہے۔ اور فوراً ہی گزر جاتا ہے میں ان میں سے کسی کو باندھ کر نہیں رکھ سکتا۔ ہاں ایک دو واقعات ایسے بھی ہیں۔ جو گھرت کماری کے پتوں کی کشتیوں کے بھنور میں چکر کھانے کی طرح بار بار مجھے یاد آجاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ آج میرے دل میں چکر لگا رہا ہے۔ اور وہ اپنی داستان خود سنانے کو بیتاب ہے۔ اگرچہ وہ ایک بہت چھوٹا سا معاملہ ہے۔ جیسے کاغذ کی کشتیاں ہوتی ہیں۔ جن میں سوائے دو چھوٹے سے بتولوں کے اور کچھ سامان لدا ہوا نہیں ہوتا۔ اور جب وہ کاغذی کشتیاں بھنور میں ڈوب جاتی ہیں تو چھوٹی لڑکی جس نے ان کو دریا میں چھوڑا تھا ایک ٹھنڈی سانس بھر کر گھر کو چل دیتی ہے۔

(۲)

مندر کے قریب جہاں تم گوسائیں کی گئوشالہ دیکھتے ہو، برگد کا درخت تھا۔ ہفتہ میں ایک روز یہاں میلا لگا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں گوسائیں نے

یہاں سکونت اختیار نہیں کی تھی اور صرف درختوں کے پتوں سے چھپا ہوا ایک چھپر تھا۔ جہاں آج کل وہ عظیم الشان عمارت بنا ہوا ہے یہ برگد کا درخت جس نے اپنا ہاتھ میری پسلیوں میں ڈال رکھا ہے اور اپنی لمبی اور سخت جڑوں کی انگلیوں سے میرے شکستہ سنگین دل کو دبا رہا ہوا ہے۔ اس زمانہ میں ایک ننھا سا پودا تھا۔ اس نے ابھی زمین سے سر نکالا ہی تھا۔ دھوپ کے وقت اس کے پتوں کا سایہ میری سطح پر کھیلا کرتا تھا اور اس کی نرم نرم جڑیں بچہ کی انگلیوں کی طرح میرے سینہ سے چمٹی رہتی تھیں۔ اگر کوئی شخص اس کا پتہ کبھی توڑتا تو مجھے صدمہ پہنچتا تھا۔ اگرچہ میں بوڑھا تھا تاہم اس وقت تک سیدھا کھڑا تھا۔ اب میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اور تمام انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ ہزارہا شکن میرے جسم پر پڑ گئے ہیں۔ دنیا بھر کے مینڈکوں نے جاڑوں کی لمبی نیند کے لئے میرے سوراخوں میں گھر بنا لیا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں میری یہ افسوسناک حالت نہ تھی۔ میرے بائیں پہلو سے صرف دو اینٹیں گری تھیں جس کی وجہ سے سوراخ بن گیا تھا۔ جس میں ایک چڑیا نے گھونسلہ بنا لیا تھا۔ طلوع آفتاب کے وقت جب وہ بیدار ہوتی تو چھپکلی کی طرح اپنی دم کو ادھر ادھر حرکت دے کر گاتی ہوئی اڑ جاتی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوتا تھا کہ ایک چھوٹی لڑکی کسم اشنان کرنے کے لئے آنے والی ہے۔

دوسری لڑکیاں اسے کسم کہتی تھیں۔ کیونکہ یہی اس کا نام تھا۔ جب اس کے چھوٹے سے جسم کا عکس پانی پر پڑتا تو میری یہ آرزو ہوتی کہ

وہ دیر تک قائم رہے اور وہ میرے پتھر دل پر نقش ہو جائے وہ ایسی سندر تھی
کہ جب وہ اپنا قدم میری سطح پر رکھتی۔ اور اس کے چاروں بچھوؤں کی جھنکار
پیدا ہوتی۔ تو میرے کائی آلود دامن میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ نہ وہ زیادہ
کھیلتی تھی۔ اور نہ زیادہ بولتی تھی نہ حد سے زیادہ خوش طبع تھی،
لیکن ایک بات عجیب تھی کہ اس کی سہیلیاں بے شمار تھیں تمام طرار لڑکیاں
اس کے ساتھ رہا کرتی تھیں اور بعض اس کو کسی نام سے پکارتی تھیں بعض
اس کو خوشی کہتی تھیں اور بعض راکھشی مگر اس کی ماں اسی کو کشمی
کہا کرتی تھی۔ میں نے اس لڑکی کو اکثر پانی کے کنارے بیٹھے دیکھا، وہ پانی
کے نظارہ کی بہت شائق تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد کسُم نے دریا پر آنا بند کر دیا
اس کی دو سہیلیاں بھوبن اور سوارن ایک روز گھاٹ پر بیٹھی ہوئی
اس کی جدائی کا افسوس کر رہی تھیں، وہ کہتی تھیں، کہ کسُم اپنے شوہر
کے گھر چلی گئی ہے، وہ جگہ دریا سے بہت دور ہے۔ جہاں بالکل اجنبی رستے
اور اجنبی آدمی ہیں۔ گویا ایک کنول کے پودے کو خشک دماغ میں
لگانے کو لے گئے ہیں۔

اس بات کو ایک سال گزر گیا۔ گھاٹ پر آنے والی عورتیں اب کسُم
کا بہت کم ذکر کرتی تھیں۔ لیکن ایک شام کو اچانک میں نے ان قدموں کو
محسوس کیا، جن سے عرصہ دراز تک آشنا رہا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ
کسُم کی چال ہے۔ بیشک وہی تھی۔ مگر افسوس کہ اس کے پاؤں اب
بچھوؤں سے خالی تھے۔ اس کی رفتار کی وہ خوشگوار آواز جاتی رہی تھی۔

چونکہ میں بہت دنوں تک بچھوؤں کی جھنکار کے ساتھ اس کے پاؤں کی آہٹ سنتا رہا تھا۔ جب اس روز وہ مجھے سنائی نہ دی۔ تو پانی کی گڑگڑاہٹ میرے کانوں میں صدائے ماتم محسوس ہوئی۔ اور آم کے جھنڈوں میں پتوں کی سرسراہٹ ہوا کی آہ وزاری معلوم ہونے لگی۔

(۳)

کسم اب بیوہ ہو گئی تھی۔ لوگ کہتے تھے۔ اس کا شوہر کسی دور دراز جگہ ملازم تھا۔ اور وہ اس سے صرف ایک دو دفعہ ملی تھی۔ دفعتاً ایک چٹھی اس کے شوہر کی وفات کی خبر لائی۔ اور وہ آٹھ سال کی لڑکی بیوہ ہو گئی۔ اس نے سیندور ماتھے سے اتار دیا۔ جو سہاگ کی نشانی ہوتی ہے۔ تمام زیور بڑھا دیا اور اپنے والدین کے گھر چلی آئی۔ لیکن اس نے اپنی بہت کم سہیلیوں کو یہاں پایا۔ بھوبن، سوارن اور ملا کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے سسرال چلی گئی تھیں۔ صرف سرت باقی تھی۔ لیکن دسمبر میں اس کی بھی شادی ہونیوالی تھی۔ اب کسم تنہا تھی۔ وہ اکثر اپنا سر زانوؤں پر رکھے چپ چاپ میری سیڑھیوں پر بیٹھی رہتی تھی۔ جس طرح موسم برسات میں گنگا پورے چڑھاؤ پر آجاتی ہے۔ اسی طرح کسم روز بروز حسن وشباب میں ترقی کرنے لگی۔ لیکن اس کی بیرنگ ساری اس کے اداس چہرہ اور خاموش رویہ نے اس کی جوانی اور شباب کو عوام کی نگاہوں سے چھپا رکھا تھا۔ کسی نے خیال نہ کیا کہ کسم جوان ہو گئی۔ بلکہ مجھے ذرا بھی محسوس نہ ہوا۔ میرے لئے تو وہی چھوٹی سی لڑکی تھی۔ جو پہلے تھی۔ اس کے پاؤں میں بچھوے نہ تھے۔ لیکن جس وقت

رہ چلتی تھی۔ تو بھی عالم خیال میں ان کی آواز سنتا تھا۔

اس طرح دس سال گزر گئے۔ اور گاؤں والوں میں سے کسی نے بھی وقت کے گزر جانے کو محسوس نہ کیا۔ اس سال ستمبر کے آخر میں آج کا سا ایک دن آیا۔ تمہاری دادیوں نے حسب معمول خوشنما دھوپ کو دیکھا جیسے تم آج دیکھ رہے ہو۔ وہ گاؤں کی پُر فضا گلیوں سے کلسے بغل میں دبائے ہوئے باتیں کرتی پانی بھرنے آئیں۔ اس وقت تک تمہارے دنیا میں آنے کا خیال تک نہ تھا۔ آج کے دن تم پورے طور پر اس بات کو ہرگز دھیان میں نہیں لا سکتے کہ تمہاری دادیاں جب کہ وہ چھوٹی لڑکیاں تھیں۔ کسی زمانہ میں ادھر ادھر دریا کے کنارے دوڑا کرتی تھیں۔ اور وہ دن ایسا ہی اصلی اور حقیقی تھا۔ جیسا کہ آج کا دن ہے۔ اور وہ بھی تمہاری طرح اپنے نازک دلوں میں رنج و خوشی محسوس کرتی تھیں۔ اور ان کے لئے یہ بات ناممکن خیال تھی کہ دھوپ سے منور موسم خزاں کا دن ایک ایسا بھی آئے گا۔ جب کہ ان کی ہستیاں مٹ چکی ہوں گی۔ اور جب ان کے رنج و راحت کا ہر ایک سامان گم ہو چکا ہوگا۔

(۴)

اس روز طلوع آفتاب کے وقت سے ہی اتر کی ہوا آہستہ چل رہی تھی اور کبھی کبھی پیپل کے چند پتے میری سیڑھیوں پر گراتی تھی۔ رات کی شبنم کے نشان کہیں کہیں میرے سنگی جسم پر موجود تھے۔ اسی صبح کو ایک بلند اور بالا خوبصورت۔ گورے رنگ کے سنیاسی نے میرے سامنے

شوجی کے مندر میں آکر قیام کیا۔ معلوم نہیں وہ کہاں سے آیا تھا۔ بہرحال گاؤں میں اس کے آنے کی دھوم مچ گئی۔ عورتوں نے اپنے کلسے رکھ دیئے اور سادھو کو نمسکار کرنے کے لیے مندر میں جمع ہو گئیں۔ ہر روز خلقت کا ہجوم سادھو کے درشنوں کے لیے بڑھتا جاتا تھا وہ سنیاسی بے نظیر خوبصورت جوان تھا۔ وہ خوش خلق بھی تھا۔ وہ بچوں کو گود میں اٹھا لیتا۔ اور عورتوں سے اُن کے گھر کے حال دریافت کرتا۔ کچھ عرصہ میں تمام عورتیں اس کی معتقد ہو گئیں۔ بہت سے مرد بھی اس کے پاس آتے تھے۔ وہ کسی روز بھاگوت کی کتھا کرتا۔ اور کسی روز گیتا کی اور کسی دن کسی اور شاستر کا اپدیش سناتا۔ بعض اس سے اپنی مشکلات میں مشورہ لیتے۔ بعض کسی کتاب کا سبق اور بعض دوا دارو کے جاتے۔ اس کی صورت پر ایسا جلال تھا گویا مہادیو انسان کی صورت اختیار کر کے خود اپنے مندر میں اتر آئے ہیں۔ جب پو پھٹنے سے پہلے سنیاسی چھاتی تک پانی میں کھڑا ہو کر صبح کے ستارہ کی طرف نظر جما کر سُریلی آواز میں وید منتر پڑھتا تو پانی کے شور و غل کی طرف سے میں اپنا دھیان ہٹا لیتا۔ جب گنگا کے مغربی کنارے پر آسمان میں شفق سحر نمودار ہوتی۔ اور بادلوں کے کناروں پر سرخ نشان لگاتی تو رات کی تاریکی غنچہ کی چٹک کی طرح دور ہو جاتی اور صبح ایک پھول کی طرح اپنی سرخ جھلک آہستہ آہستہ آسمان کی جھیل میں دکھلاتی ہوئی آتی۔ پھر درختوں کی چوٹیاں افق پر صاف نظر آنے لگتیں ہوا بیدار ہوتی۔ آسمان کی رنگت خاکی ہونے لگتی۔ اور آخر ایک

نامعلوم علاقہ سے درختوں کی اوٹ میں صبح کا اشنان کر کے پوتر سورج قدم بقدم آسمان پر چڑھنا شروع کرتا۔ میرا خیال یہ تھا کہ چونکہ وہ مہاپرش پانی میں کھڑا ہو کر مشرق کی طرف منہ کر کے پڑھتا تھا وہ منتر پڑھتا تھا۔ اس کے ہر ایک لفظ سے رات کا پردہ پھٹتا جاتا تھا۔ چاند اور ستارے مغرب میں ڈوب جاتے اور سورج مشرق میں نمودار ہو کر دنیا کا نقشہ بدل دیتا تھا۔ یہ سنیاسی کیسا کراماتی تھا۔ اشنان کر کے جب وہ دریا سے نکلتا تو یگیہ کی آگ کے شعلہ کی طرح اس کا سندر اور مقدس جسم چمکتا۔ اس کے بالوں کی لٹوں سے پانی کے قطرے ٹپکتے اور نئے سورج کی روشنی اس کے جسم سے ٹکرا کر واپس آتی تھی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ اپریل کے مہینے میں سورج گرہن پر بہت سے یاتری گنگا میں اشنان کرنے آئے۔ اور پیپل کے درخت کے نیچے میلہ لگا۔ بہت سے یاتری سنیاسی کو دیکھنے آئے۔ ان میں اس گاؤں کی بھی کچھ عورتیں تھیں۔ جہاں کسم بیاہی گئی تھی۔ صبح کے وقت سنیاسی میری سیڑھیوں پر بیٹھا جپ کر رہا تھا۔ کہ دفعتاً ایک یاتری عورت نے دوسری عورت سے کہا۔ "دیکھو یہ تو ہماری کسم کا شوہر ہے؟"

دوسری نے اپنا گھونگٹ ذرا ہٹا کر دیکھا اور کہا۔ "بیشک وہی ہے یہ"

تیسری نے کہا۔ "دیکھو تو اس کی آنکھیں ناک اور ابرو بالکل ویسے ہی ہیں"

لیکن ایک اور عورت نے سنیاسی کو دیکھے بغیر ہی اپنا کلسہ پانی میں بھرتے ہوئے کہا۔ "وہ بے چارا تو کبھی کا مر چکا۔ اب وہ دنیا میں

نہیں آئے گا۔ بے چاری کسم کی قسمت !"

ایک عورت نے کہا: "اس کے اتنی بڑی داڑھی نہ تھی!"

دوسری نے کہا: "وہ ایسا دبلا نہ تھا اور نہ اتنا بلند قامت!"

اس قدر بات چیت کے بعد معاملہ ختم ہو گیا۔ گاؤں کے سب آدمیوں نے سنیاسی کو دیکھا تھا مگر کسم کو کبھی اس کے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا کیونکہ اس نے دریا پر ایسے وقت جب کہ آدمیوں کا ہجوم ہوتا آنا بند کر دیا تھا۔

ایک روز پورنماشی کی شام کو وہ گھاٹ پر آئی۔ اس وقت گھاٹ پر کوئی نہ تھا۔ چمگادڑیں اِدھر اُدھر گشت لگا رہی تھیں۔ مندر میں گھنٹے اور گھڑیال ابھی بج کر ختم ہوئے تھے۔ گھڑیال کی آخری آواز کی گونج ہلکی ہوتے ہوئے سایہ کی طرح دوسرے ساحل کے گھنے جھنڈوں میں جا کر ختم ہو گئی تھی۔ آسمان پر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ کسم اپنا سایہ مجھ پر ڈالے ہوئے بیٹھی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ درخت ذرا نہ ہلتے تھے۔ اس کے سامنے گنگا کی چادر پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے اِدھر اُدھر جھاڑیوں اور جھنڈوں میں مندر کے سایہ میں۔ کھنڈروں کے دامن میں۔ تالاب کے پہلو میں تاریکی اپنا منہ چھپاتی پھرتی تھی۔ مندر کی چھت پر اُلو غمگین چیخیں مار رہا تھا۔ مکانات کے قریب گیدڑوں کی پکار کبھی کبھی سنائی دیتی اور سناٹے میں کم ہو جاتی تھی۔ سنیاسی آہستہ سے مندر کے باہر نکلا۔ اور گھاٹ کی چند سیڑھیاں اُتر کر اس نے ایک عورت کو تنہا کھڑا پایا۔ وہ واپس جانے کو تھا۔ کہ دفعتاً کسم نے اپنا سر اٹھایا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ساڑی اس کے

سرے سرک گئی۔ اور جس طرح چاندنی ایک تازہ کھلے ہوئے پھول پر چمکتی ہے۔
اسی طرح وہ اس کے منہ پر درخشاں ہوئی جب اس نے سراوپر اٹھایا۔ اس
وقت دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ گویا انھوں نے ایک دوسرے کو پہچان
لیا۔ اور انہیں ایسا محسوس ہوا کہ شاید کسی پہلے جنم میں وہ ایک دوسرے
کے واقف تھے۔ یہ میرا خیال تھا۔ ورنہ وہ دونوں ایک لمحہ تک تصویر کی
طرح خاموش کھڑے نہ رہتے۔ جب کہ چاندنی میں ان کے سائے میری
سطح پر باہم دگر ہم آغوش پڑے تھے۔ اُلّو بولتا ہوا ان کے سر پر سے
گذر گیا۔ اس کی آواز سن کر کسم چونکی اور ساڑی کا پلہ اپنے سر پر کر لیا۔
پھر اس نے جھک کر سنیاسی کے قدم چھو لئے۔ سنیاسی نے اس کو آشیرواد
دے کر پوچھا۔ ”تم کون ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں کسم“

اس رات اس سے زیادہ اور کوئی کلام ان کے درمیان نہیں ہوا۔ کسم
آہستگی سے اپنے گھر کو روانہ ہوئی۔ لیکن سنیاسی اس رات گھنٹوں میری
سیڑھیوں پر بیٹھا رہا۔ آخر جب چاند مشرق سے گشت کر کے مغرب کی طرف
چلا گیا۔ اور سنیاسی کا سایہ اس کے پیچھے سے سامنے کی طرف آنے
لگا تو وہ کھڑا ہوا اور مندر کی طرف چلا گیا۔

(۵)

میں نے دیکھا کہ دوسرے دن سے کسم ہر روز آ کر سنیاسی کو پرنام کرتی
اور جب وہ کتھا سناتا تو ایک گوشہ میں کھڑی ہو کر سنا کرتی۔ سنیاسی

اپنے صبح کے نت نیم سے فارغ ہوکر گیشم کو اپنے پاس بلاتا اور اُس سے مذہبی
معاملات پر گفتگو کرتا۔ وہ ہندو فلسفہ کے باریک مسائل کو بخوبی نہیں سمجھ سکتی تھی
تاہم وہ بڑی توجہ سے خاموشی کے ساتھ اس کی تقریر سنتی تھی۔
سنیاسی جس جس طرح اس کو ہدایت کرتا۔ اس کی تہ دل سے حرف بحرف تعمیل کرتی
وہ ہر روز مندر کی پوجا کرتی۔ مندر کا فرش دھونے کو گنگا کا پانی بھر کر لاتی اور پوجا
کے لیے پھول چنا کرتی تھی۔ سنیاسی اُس کو جو تعلیم دیتا وہ پیڑ بیٹوں پر بیٹھ
کر اُسی پر غور کرتی۔ رفتہ رفتہ اس کی نظر وسیع ہوتی گئی اور دل کے پٹ
کھلنے گئے۔ اس کے دھیان میں وہ باتیں آنے لگیں جو پہلے کبھی نہ گزرتی
تھیں۔ وہ وہ کچھ سننے لگی جو پہلے کبھی اس کے کانوں نے نہیں سنا تھا
اس کے اُداس چہرہ سے ملال کی رنگت دور ہوگئی۔ وہ اس پھول کی طرح
معصوم اور پاک معلوم ہونے لگی۔ جو صبح کی شبنم سے دھویا ہوا دیوتاؤں
کی پوجا کے لیے لایا جاتا ہے۔ اور جب وہ صبح کے وقت دلی اعتقاد کے ساتھ
سنیاسی کے قدموں پر جھکتی۔ تو وہ اس پھول کی مانند معلوم ہوتی تھی۔ جو
ہون کنڈ پر چڑھایا گیا ہو۔ پاکیزہ بشاشت نے اُس کے سارے جسم کو
منور کر رکھا تھا۔

جاڑے کا موسم ختم ہونے کو تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلتے تھے
لیکن کبھی کبھی خلاف توقع جنوب کی طرف سے موسم بہار کی گرم ہوا کا جھونکا بھی آ
جاتا تھا۔ شام کے وقت آسمان پر سردی کی سی رنگت باقی نہ رہی تھی۔ بہت
عرصہ کے بعد گاؤں سے بانسری اور دوسرے باجوں کی آوازیں آنے لگی

تھیں۔ ملاح اپنی کشتیاں بجائے رسوں سے کھینچنے کے دھار پر چلانے اور
سری کرشن بھگوان کی تعریف کے بھجن گانے لگے۔ پرندوں نے بڑی خوشی
کے ساتھ درختوں پر چہچہانا شروع کر دیا۔ ان دنوں موسم بہار کی خوشگوار
ہوا نے میرے دل میں نئی جوانی بھر دی تھی۔ پودوں میں نئے شگوفے پھوٹنے
شروع ہو گئے تھے۔ مگر ایسے زمانہ میں کسم نے گنگا پر آنا چھوڑ دیا۔ اس کے
بعد کیا ہوا۔ مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد شام کو وہ دونوں
میری سیڑھیوں پر ملے۔ کسم نے نیچی نظر کیے ہوئے سوال کیا "مہاراج
آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

سنیاسی نے جواب دیا "ہاں۔ کیا وجہ ہے کہ اب تم نے آنا چھوڑ دیا
اب تم نے پوجا کرنی کیوں ترک کر دی ہے"

کسم خاموش رہی۔

سنیاسی نے کہا "تم اپنے دل کا سارا حال بے کم و کاست مجھے سناؤ"

کسم نے منہ پھیر کر کہا "مہاراج میں پاپن ہو گئی ہوں۔ اس لیے پوجا
کرنی چھوڑ دی"

سنیاسی نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "کسم میں جانتا ہوں۔ تمہارے
دل میں بے اطمینانی ہے"

کسم ذرا جھجکی۔ اُسے اندیشہ ہوا کہ شاید وہ سب کچھ جانتا ہے۔ دفعتہ
اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ وہ ساڑی کا آنچل منہ پر ڈال کر سنیاسی
کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی اور رونے لگی۔ سنیاسی دو ایک قدم

پرے ہٹ گیا۔ اور اس نے کہا" اپنی سرگزشت مجھے سناؤ میں تمہیں اطمینان کی راہ دکھاؤں گا۔"

اس نے ایسے لہجہ میں جس کے ایک ایک لفظ سے سچائی ٹپکتی تھی لیکن کبھی کبھی اس کی زبان رک جاتی تھی۔ جواب دیا۔

اگر آپ حکم دیتے ہیں تو میں سب حال عرض کر دوں گی۔ لیکن میں صاف لفظوں میں نہیں کہہ سکتی۔ غالباً آپ نے خود ہی قیاس کر لیا ہو گا۔ کہ اصلی معاملہ کیا ہے۔ میں نے ایک شخص کو ایشور سمجھا اور اس کی پرستش کی۔ اور اس کی بھگتی کا جذبہ میرے رونئیں رونئیں میں بس گیا۔ لیکن ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے دل کے مالک نے ایک باغ میں میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا ہے۔ اور محبت کی باتیں کرتا ہے اس وقت یہ تمام نظارہ مجھے ناممکن یا اجنبی محسوس نہ ہوا۔ خواب گزر گیا لیکن اس کا اثر دل میں ہمیشہ کے لئے رہ گیا۔ دوسرے دن جب میں نے اس کو دیکھا تو وہ پہلے کی نسبت دوسرے رنگ میں نظر آیا۔ خواب کی وہ تصویر میرے دل پر قابض ہو گئی۔ میں خوفزدہ ہو کر اس سے دور رہنے لگی۔ لیکن اس کے تصور نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس وقت سے میرے دل کو چین نہیں اور میرے اندر بالکل اندھیرا چھا گیا ہے۔

(۶)

جب وہ آنسو پونچھتی ہوئی اپنی کہانی سنا رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ سنیاسی اپنے دائیں پاؤں سے میری سطح کو زور سے دبا رہا تھا۔

سنیاسی نے کہا "تمہیں بتانا چاہیئے کہ تم نے کس شخص کو خواب میں دیکھا
کسم نے ہاتھ جوڑ کر کہا" یہ میں نہیں بتلا سکتی"
سنیاسی نے کہا "میں تمہاری بہتری کے لیئے پوچھتا ہوں۔ سچ سچ بتاؤ
وہ کون ہے؟"
کسم نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے لیکن بدستور جوڑے جواب دیا۔ "مجھے
ضرور بتانا ہوگا؟"
سنیاسی نے کہا "ہاں ضرور!"
وہ فوراً چلا اٹھی "مہاراج وہ شخص آپ ہی ہیں"
اور جب وہ یہ الفاظ کہہ چکی۔ تو ایک دم بے ہوش ہو کر سیڑھی سے پھول
پر گر پڑی۔
لیکن سنیاسی ایک پتھر کی مورت کی طرح اسی جگہ کھڑا رہا۔
جب اس کو ہوش آیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی تو سنیاسی نے آہستہ سے کہا۔
"کسم تم نے اب تک میری ہر ایک ہدایت کی تعمیل کی ہے۔ میں ایک اور حکم
تمہیں دوں گا۔ اسی کی بھی تمہیں تعمیل کرنی ہوگی۔ میں آج رات یہاں سے
چلا جاؤں گا۔ اور تم پھر مجھے نہ دیکھو گی۔ اس لیئے میں کہتا ہوں۔ تم مجھے
بالکل بھول جاؤ۔ وعدہ کرو کہ تم ضرور ایسا کرو گی"
کسم سیدھی کھڑی ہو گئی۔ سنیاسی کے منہ کی طرف دیکھا اور دبی آواز
میں جواب دیا۔
"مہاراج جیسا آپ فرماتے ہیں اسی طرح ہوگا"

سنیاسی نے کہا: "بس اب میں جاتا ہوں۔"

ایک لفظ زبان سے نکلے بغیر کسم آگے جھکی اور سنیاسی کے پاؤں کی خاک لے کر اپنے سر پہ ڈال لی۔

سنیاسی وہاں سے چلا گیا۔

کسم نے اپنے دل میں کہا: "اس کا حکم یہ ہے کہ میں اُسے بھول جاؤں۔"

اس کے بعد آہستہ آہستہ وہ دریا کی طرف گئی۔ جب کہ وہ ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ اسی دریا کے کنارے رہی تھی۔ اگر مشکل کے وقت میں دریا اسے گود میں لینے کے لئے ہاتھ نہ پھیلاتا تو دوسرا کون اس کی مدد کرتا۔

چاند چھپ گیا۔ رات تاریک ہوگئی۔

میں نے پانی میں کسی کے کودنے کی آواز سُنی۔ لیکن اندھیرے میں دیکھا کچھ نہیں۔ رات کی تاریکی میں ہولناک ہوا بڑے زور سے چلی۔ گویا وہ آسمان کے تمام ستاروں کے چراغ گل کرنا چاہتی تھی تاکہ کوئی اس سانحہ ہوشربا کو دیکھ نہ لے۔

وہ جو میری گود میں کھیلتی رہی تھی۔ آج کی رات اس نے اپنا کھیل ختم کیا۔ میری گود چلی گئی۔ خدا جانے کہاں؟

---

(۱)

میری کشتی نے اشنان گھاٹ کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں کے قریب لنگر ڈالا سورج غروب ہو چکا تھا۔ ملاح تختہ کشتی پر ہی نماز مغرب ادا کرنے لگا ہر رکوع و سجود کے بعد اس کی سیاہ شبیہ شفق آلود آسمان کے نیچے زیر آب پہنچ جاتی۔

دریا کے کنارے ایک قدیم بوسیدہ عمارت کھڑی۔ جس کا چھجا اس قدر جھکا ہوا تھا کہ اس کے گر پڑنے کا ہر گھڑی قوی الاندیشہ تھا اس نے دروازوں اور کھڑکیوں کے کواڑ شکستہ و ریختہ ہو چکے تھے ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس پر سکوت فضا میں اچانک ایک انسانی آواز میرے کان میں پڑی اور میں کانپ اٹھا۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

میں نے گردن پھرا کر دیکھا تو ایک زرد و لاغر اور ضعیف آدمی کی شکل نظر آئی جس کے پنجر نکلے ہوئے تھے۔ بدقسمتی کے آثار سراپا سے ہویدا۔ وہ

مجھ سے دو چار سیڑھیاں اوپر کھڑا تھا۔ سلک کا میلا کوٹ اور اس کے نیچے ایک میلی سی دھوتی پہنے ہوئے اس کا نحیف بدن، ستا ہوا چہرہ اور لڑکھڑانے والے قدم پتہ دیتے تھے۔ کہ اس فاقہ زدہ کو تازہ ہوا سے زیادہ خوراک کی ضرورت تھی۔

"میں رانچی سے آیا ہوں"

یہ سن کر وہ میرے برابر اسی سیڑھی پر آ بیٹھا۔

"اور آپ کا شغل؟"

"تجارت کرتا ہوں"

"کاہے کی؟"

"عمارتی لکڑی۔ ریشم کے کوئے اور ترمپھلا کی"

"آپ کا نام؟"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں نے اُسے ایک فرضی نام بتا دیا لیکن وہ اب متجسّسانہ مجھے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن آپ کا یہاں کیسے آنا ہوا؟"

محض تفریحاً یا تبدیل آب و ہوا کے لیے"

"تبدیل آب و ہوا۔ یہ بھی خوب کہی۔ میں چھ سال سے تقریباً ہر روز یہاں کی تازہ ہوا پیٹ بھر کر کھا رہا ہوں۔ اور ساتھ ہی پندرہ گرین کونین بھی لیکن اثر کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی فائدہ نہیں نظر نہیں آتا"

"لیکن رانچی اور یہاں کی آب و ہوا میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔

"اس میں شک نہیں۔ لیکن آپ یہاں ٹھہرے کس جگہ ہیں؟ کیا اسی مکان میں؟"

غالباً اس شخص کو شبہ ہو گیا تھا کہ مجھے اُس کے دفینہ کا کہیں سے سراغ مل گیا ہے۔ اور اس جگہ اقامت کی غرض سے نہیں بلکہ اس دفینہ پر قبضہ جمانے آیا ہوں۔ مکان کی کھلائی بُرائی کے متعلق ایک حرف تک کہے بغیر اس نے اس کے مکین کی پندرہ سالہ ایک لمبی سرگذشت بیان کرنی شروع کر دی۔

اس کی گنجی کھوپری میں گہری اور چمکدار سیاہ آنکھیں مجھے کالرج کے قدیم ملاح کی یاد دلا رہی تھیں۔ وہ ایک مقامی سکول میں مدرس تھا۔

ملاح نے عبادت سے فراغت پا کر روٹی پکانا شروع کر دی۔ شفق کی سرخی پر غالب آنے والی سیاہی میں یہ کھنڈر عمارت ایک عجیب بھیانک منظر پیش کر رہی تھی۔

سکول ماسٹر نے کہا۔

"میرے اس گاؤں میں آنے سے تقریباً دس سال پیشتر ایک شخص یعنی بھوشن سہلے اس مکان میں رہتا تھا۔ اس کا چچا درگا موہن لاولد مر گیا۔ جس کی کل جائداد اور وسیع کاروبار کا واحد وارث یہی قرار پایا۔

انگریزی تعلیم اور نئی تہذیب کا بھوت اس پر سوار تھا۔ کالج میں کئی سال تعلیم پا چکا تھا۔ وہ انگریزوں کی طرح کوٹھیوں میں جوتا پہنے پھرا کرتا تھا۔ اور صاحب لوگوں کے ساتھ فراٹے کی انگریزی بولتا تھا تو یہ کہنے کی حاجت

نہیں کہ یہ لوگ اس کے ساتھ کوئی تجارتی مراعات برتنے کے روادار نہ تھے وہ بخوبی
جانتے تھے کہ کمپنی بہادر، آخر حدید بنگال کی ہوا میں سانس لے رہا ہے۔
اس کے علاوہ ایک اور بلا اس کے سر پر سوار تھی یعنی اس کی بیوی کی نہایت ہی
خوبصورت تھی۔ یہ خوبصورت بلا اور انگریزی تعلیم دونوں اس کے پیچھے ... پڑ
تھیں کہ تو یہ کھیلی۔ اخراجات حد سے بڑھے ہوئے تھے۔ ذرا بدن گرم ہوا
اور جھٹ سرکاری ڈاکٹر کوٹ کھٹ کرا پہنچے۔
شادی غالباً آپ کی بھی ہو چکی ہے۔ آپ کو بھی یقیناً یہ تجربہ ہو گیا ہو گا کہ
عورت سخت گیر خاوند کو ہمیشہ پسند کرتی ہے۔ وہ بد قسمت شخص جو اپنی بیوی
محبت سے محروم ہو یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ وہ دولت سے مالا مال نہیں یا حسن کی
نعمت سے بے بہرہ ہے۔ نہیں۔ یقین مانیے وہ اپنی حد سے نرم طبیعت اور
محبت کے باعث اس بد قسمتی میں مبتلا ہے۔ میں نے اس معاملہ پر خوب غور
کیا ہے۔ اور اس فیصلہ پر پہنچا ہوں اور یہ ہے بھی ٹھیک پر چھیے کیوں؟
لیجیے اس سوال کا مدلل اور مفصل جواب یہ ہے۔
یہ تو آپ ضرور مانیں گے کہ کوئی شخص اس وقت تک حقیقی مسرت حاصل
نہیں کر سکتا جب تک کہ اسے اپنے طبعی رجحانات اور فطری قابلیتوں کے اظہار
کے لیے ایک وسیع میدانِ عمل میسر نہ ہو۔ ہرن کو آپ نے دیکھا ہے وہ اپنے
سینگوں کو سخت درخت سے گھس کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ نرم و نازک
کیلے کے تنے سے نہیں۔ ابتدائے آفرینش سے صنفِ نازک اس وحشی اور
تلون مزاج مرد کو رام کرنے کے لیے مخصوص انداز سیکھتی چلی آ رہی

ہے۔ اگر اُسے پہلے ہی سے رام شدہ خاوند مل جائے تو اس کے یہ دلکش حربے جو اس کی ماؤں اور دادیوں سے ورثہ میں ملے ہیں۔ اور عرصہ دراز سے متواتر چلتے رہنے کی بنا پر صدد رجہ موثر بھی ہو چکے ہیں، نہ صرف بیکار رہ جاتے ہیں بلکہ عورت کو بارِ گراں معلوم ہونے لگتے ہیں۔

عورت اپنے دلکش حسن کے زور سے مرد کی محبت اور اطاعت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ لیکن جو خاوند خود بخود مطیع ہو جائے وہ واقعی بدبخت ہے۔ اور اس سے زیادہ اس کی بیوی۔

تہذیب حاضرہ نے ایک خداداد نعمت یعنی "مرد کی شاندار بربریت" اس سے چھین لی ہے۔ مرد نے اپنی کمزوری سے عورت کے ازدواجی بندھنوں کو بڑی حد تک ڈھیلا کر دیا ہے۔ ہمارا یہ بدقسمت پیتی کچوشن بھی اسی نئی تہذیب کی سوہن سے چھلا ہوا تھا۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ نہ وہ اپنے تجارتی کاروبار میں کامیاب تھا۔ اور نہ اپنی گرہستی زندگی سے شادکام اگر ایک طرف وہ اپنی تجارت میں منافع سے بے بہرہ تھا۔ تو دوسری طرف اپنی بیوی کے شوہری حق سے محروم۔

یعنی کچوشن کی بیوی کو محبت اور اطاعت بے مانگے ملی تھی۔ اس کی دل فریب اور گراں بہا ساڑیوں کے لئے منت کیا معنی خاوند سے سوال کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ مرصع طلائی زیورات کے لئے اُسے جھگڑنا نہ پڑتا تھا۔ اس لئے اس کی نسوانی فطرت کو کار فرمائی اور مجرمانہ انداز سے اپنے پرستار کے جذبات محبت میں ہیجان انگیزی کی

نوبت نہ آتی تھی۔ اس کے کان "لو قبول کرو" کے خوش آیند الفاظ سے آشنا تھے۔ لیکن اس کے لب "لاؤ" اور "دو" سے قطعی نابلد تھے اس کا سادہ لوح خاوند اس خیال باطل میں مگن تھا کہ "دیئے جانا اور کسی معاوضہ کی امید نہ رکھنا" اکارت نہیں جا سکتا وہ اسی غلط فہمی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اُس کی بیوی اُسے ایک ایسی کل سمجھنے لگی۔ جو بغیر چلائے چلتی تھی۔ اور خود بخود بلا زحمت طلب اعلیٰ سے اعلیٰ ساریاں اور گراں بہا زیورات بنا کر اُس کے قدموں پر ڈالتی رہتی تھی اس کے پُرزے اسی قدر مضبوط اور دیرپا تھے کہ کبھی بھی اُن کو تیل دینے کی ضرورت نہ تھی۔

بینی بھوشن کا مولد اور مسکن قرب وجوار کا ایک گاؤں تھا۔ لیکن اس کے چچا کے تجارتی کاروبار کا مرکز یہی شہر تھا اسی وجہ سے اس کی عمر کا بیشتر حصہ یہیں گزرا تھا۔ گو ماں مر چکی تھی لیکن خالائیں ممانیاں وغیرہ خدا کے فضل سے موجود تھیں لیکن وہ شادی کے فوراً ہی بعد منی ملکہ کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے شادی اپنے آرام کی خاطر کی تھی۔ نہ کہ اپنے رشتہ داروں کی خدمت کے لئے۔

بیوی اور دیگر مقبوضات میں زمین و آسمان کا فرق ہے بیوی کو حاصل کر لینا اور پھر نگہداشت کرنا اس کو اپنا بنانے کے لئے کافی نہیں ہوا کرتا۔

منی ملکہ سوسائٹی کی دلدادہ نہ تھی۔ اس لئے فضول خرچ بھی نہ تھی۔ بلکہ اس کے برعکس بڑی محتاط تھی۔ جو تحفہ بینی بھوشن اس کو ایک مرتبہ لادیتا تھا۔

پھر کیا مجال کہ اس کو ہوا بھی لگ جائے۔ وہ بحفاظت تمام رکھ دیا جاتا تھا۔
کبھی ایسا نہیں دیکھا گیا کہ کسی پڑوسن کو اس نے کھانے پر بلایا ہو۔ وہ تحفہ
تحائف لینے دینے کی بھی قائل تھی۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ بات تھی کہ چھبیس سال کی عمر میں بھی منی ملکہ
ایک چودہ سالہ نوخیز دوشیزہ معلوم ہوتی تھی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اس کے
حسن کی بہار نہ صرف قائم بلکہ دائم رہنے والی ہے۔ منی ملکہ کے پہلو میں دل
نہ تھا۔ برف کا ٹکڑا تھا۔ جس کو محبت کی ذرا سی حرارت بھی نہ پہنچی تھی۔ پھر
وہ پگھلتا کیوں؟ اور اس کی جوانی ڈھلتی کس طرح؟

جو درخت پتوں سے لدا ہوتا ہے اکثر ثمر سے بے بہرہ رہتا ہے ملکہ کا نہال
حسن بھی بے ثمر تھا۔ وہ اولاد سے بے بہرہ تھی۔ رکھ رکھاؤ اور نہ ذاتی
نگہداشت کرتی بھی تو کاہے کی۔ اس کی توجہ تمام تر اس کے زیورات پر
ہی مرکوز تھی۔ اولاد ہوتی تو موسم بہار کی میٹھی میٹھی دھوپ کی طرح
اس کے برفانی دل کو پگھلاتی اور وہ خوشگوار پانی اس کی ازدواجی زندگی
کے پژمردہ نہال کو سرسبز و شاداب کرتا۔

منی ملکہ گھر کے کام کاج اور محنت و مشقت [illegible] تراتی تھی۔ جو کام
وہ خود کر سکتی تھی۔ اس کی اجرت ادا کرنا اسے شاق گزرتا۔ دوسروں کی
تکلیف کا نہ اسے احساس تھا۔ اور نہ اعزا و اقربا کی فکر۔ اس کو اپنے
کام سے کام تھا۔ اس پرسکون زندگی کی وجہ سے وہ تندرست اور فارغ البال
تھی۔ نہ کبھی مغموم ہوتی تھی نہ رنجور۔

اکثر خاوند اسے غنیمت تو کیا خوش قسمتی سمجھیں گے کیونکہ جو بیوی ہر وقت مطالبات لے کر خاوند کی چھاتی پر چڑھی رہے وہ تمام گھرانے کیلئے ایک بیماری ثابت ہوتی ہے۔

کم از کم میری تو یہی رائے ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی محبت بیوی کے لئے شاید قابل رشک بات ہو۔ لیکن خاوند کے واسطے تو ایک مصیبت سے کم نہیں۔ ذرا خیال تو فرمایئے کہ کیا آدمی کا یہ کام ہے کہ وہ ہر گھڑی یہ تولتا ناپتا رہے کہ اس کی بیوی اُسے کتنا چاہتی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ گرہستی کی زندگی اسی وقت خوب گزرتی ہے۔ جب خاوند اپنے کام سے کام رکھے اور بیوی اپنے سے۔

واردات حسن و عشق مرد کی فہم و فراست سے بالاتر ہیں لیکن عورت مرد کی محبت کے نشیب و فراز اور کمی بیشی کو نہایت گہری نظر سے دیکھتی رہتی ہے۔ وہ الفاظ سے لہجہ کو اور کنایہ سے مطلب کو جھٹ علیحدہ کر لیتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ زندگی کے کاروبار میں عورت کی پونجی لے دے کر صرف مرد کی محبت ہے۔ یہی اس کی زندگی کا واحد سہارا ہے۔ اگر وہ مرد کے رجحانات کی ہواؤں کے رُخ کو اپنی کشتی حیات کے بادبان سے لگاتے ہیں کامیاب ہو جائے۔ تو یقیناً اس کی کشتی ساحل مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی واسطے مقیاس المحبت آدمی کے دل میں نہیں۔ بلکہ عورت کے دل میں لگایا گیا ہے۔

قدرت نے مرد اور عورت کی فطرتوں میں نمایاں امتیاز رکھا ہے۔

لیکن فرنگی تہذیب اس مابہ الامتیاز کو مٹا دینے پر تلی ہوئی ہے۔ عورت مرد بنتی جا رہی ہے اور مرد عورت۔ عورت مردانہ کیریکٹر کو سرمایہ حیات، اور مرد نسوانی کردار کو لطفِ زندگی سمجھنے لگے ہیں۔ اس لئے محال ہوگیا ہے کہ شادی کے وقت کوئی یہ کہہ سکے کہ دلہن ہے یا عورت نما مرد۔ ایسے ہی عورت انداز نہیں لگا سکتی کہ جس کے پلے وہ بندھ رہی ہے وہ مرد ہے یا مرد نما عورت۔ اس لئے کہ فرق صرف دل کا ہے۔ کیا معلوم کہ مرد کا دل نسوانی ہے یا مردانہ۔

میں بہت دیر سے آپ کی سمع خراشی کر رہا ہوں۔ لیکن ایک حد تک قابل معافی ہوں۔ میں اہل و عیال سے دور علیحدہ طبی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میری مثال اس تماشائی کی سی ہے جو دور سے گھریلو زندگی کا تماشا دیکھ رہا ہو۔ اور بجائے اس کے کہ اس کے فوائد سے متمتع ہو کر اس کے لئے سوچ سکتا ہو۔ اسی لئے ازدواجی تعلقات پر میرے خیالات نہایت گہرے ہیں۔ میں اپنے شاگردوں سے تو یہ خیالات بیان نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے آپ سے بیان کر کے اپنے دل کو ہلکا کر رہا ہوں۔ آپ فرصت میں ان پر غور کریں۔

مختصر یہ کہ اگرچہ خانگی زندگی میں بظاہر کوئی شکایت کینی محبوب تن کو نہ تھی۔ وقت پر کھانا مل جاتا تھا۔ گھر کا انتظام اچھا چل رہا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک قسم کی بے چینی اور بے اطمینانی اس کے دل میں جاگزیں تھی۔ اور وہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ ہے کیا؟ اس کی مثال اس بچہ کی سی تھی۔ جو

رو رہا ہے اور نہیں جانتا کہ اُس کے دل میں کوئی خواہش ہے۔

اپنی رفیقہ حیات کے دل کے خلائے محبت کو وہ سنہری اور مرصع زیورات اور اسی قسم کے دیگر تحائف سے بھر دینا چاہتا تھا۔

اس کا چچا درگا موہن اور قسم کا آدمی تھا۔ وہ اپنی بیوی کی محبت کو گراں قیمت پر خریدنے کا روادار نہ تھا اور نہ وہ تقاضائے محبت میں تنگ مزاج تھا۔ لیکن پھر بھی اپنی رفیقہ حیات کی محبت سے پوری طرح بہرہ ور تھا۔

جس طرح ایک کامیاب تاجر کو قدرے بد لحاظ ہونا ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح ایک کامیاب شوہر بننے کے واسطے مرد کو قدرے درشت طبع بن جانا چاہیئے۔ نہایت وثوق کے ساتھ آپ کو یہ نصیحت کرتا ہوں۔

عین اس وقت گیدڑوں کی چیخ و پکار جنگل سے سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو وہ اس سکول ماسٹر کے فلسفہ ازدواج پر حقارت آمیز ہنسی ہنس رہے ہیں یا کینی بھوشن کے بیان کی روانی کو چند منٹ کے لیے اس چیخ و پکار سے روک دیا ہے۔ بہر حال بہت جلد یہ چیخ و پکار ختم ہو گئی۔ اور پہلے سے بھی گہری تاریکی اور سکوت فضا پر مسلط ہو گیا۔ تو سکول ماسٹر نے پھر اپنی داستان چھیڑی۔

ناگہاں کینی بھوشن کے وسیع تجارتی کاروبار میں عبرتناک تنزل رونما ہوا۔ یہ کیوں ہوا؟ اس کا جواب میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ مختصر یہ کہ گردش ایام نے اس کے لیے بازار میں ساکھ رکھنا مشکل کر دیا اگر کسی طرح چند دن کے واسطے وہ ایک بہت بڑی رقم حاصل کر کے منڈیوں میں پھیلا سکتا تو

ممکن تھا کہ کساد بازاری کے طوفان سے بچ نکلتے لیکن اتنی بڑی رقم کا فوری
انتظام خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ اگر مقامی ساہوکاروں سے قرض مانگتا۔ تو طرح
طرح کی افواہیں پھیل جاتیں۔ اور اس کی ساکھ کو ناقابل تلافی نقصان
پہنچتا۔ اگر بیرونجات سے قرض کی سلسلہ جنبانی کرتا تو رقعہ پرچے کے بغیر ممکن نہ تھا۔
اور اس سے اس کی شہرت کو بڑا صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ صرف ایک طریقہ
تھا۔ کہ زیورات پر روپیہ حاصل کیا جائے۔

پھنی بھوشن ملکہ کے پاس گیا۔ لیکن وہ ایسا خاوند نہ تھا۔ کہ بیوی سے
صاف صاف اور بزور کہہ سکتا۔ بدقسمتی سے اُسے اپنی بیوی سے اسی قدر گہری
محبت تھی۔ جیسی کہ ناول کے کسی ہیرو کو ہیروئن سے ہو سکتی ہے۔

سورج کی کشش زمین پر بہت زیادہ ہے۔ لیکن کچھ زیادہ موثر نہیں
یہی حال پھنی بھوشن کے عشق کا تھا۔ اس عشق کا منی ملکہ کے دل پر کوئی اثر نہ تھا
لیکن مرتا کیا نہیں کرتا۔ مالی مشکلات کا تذکرہ۔ پرونوٹ۔ تمسک ہائے قرضہ
کساد بازاری کے حالات لرزتی ہوئی زبان سے غیر مربوط الفاظ میں پھنی
بھوشن نے بیان کیے۔ جھوٹی عزت کے غلط خیال اور جذبات کے ہیجان
میں معمولی سا معاملہ پیچیدہ بن گیا۔ مبہم الفاظ میں معاملہ کی نزاکت بیان
کرتے ڈرتے ڈرتے بدقسمت بھوشن نے کہا "تمہارے زیورات"۔

منی ملکہ نے نہ ہاں کہا نہ نہیں۔ اس کے چہرے سے بھی کچھ پتہ چل سکتا
تھا۔ اس پر گہرا سکوت طاری تھا۔ پھنی بھوشن کو سخت صدمہ ہوا۔ لیکن
اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس میں مردانہ سختی نہ تھی۔ جس چیز کا وہ بزور

مطالبہ کر سکتا۔ اس کے انکار پر اس نے کسی قسم کے رنج کا بھی اظہار نہ کیا وہ اس خیال کا آدمی تھا کہ محبت کی دنیا میں طاقت اور زبردستی کا گزر نہیں۔ بیوی کی رضامندی کے بغیر وہ زیور کو چھونا بھی حرام سمجھتا تھا۔ اس لئے مایوس ہو کر روپے کی فراہمی کے واسطے اور رسائل کی فکر میں کلکتہ چلا گیا۔

(۲)

بیوی اپنے خاوند کو خوب جانتی ہے۔ اس کے رگ و پٹھے سے بخوبی واقف ہوتی ہے۔ خاوند اپنی بیوی کے کردار کا اتنا گہرا مطالعہ نہیں کر سکتا لیکن خاوند کچھ گہرا آدمی ہو تو اس کے کردار کے بعض پہلو عورت کی تیز نگاہوں سے مخفی بھی رہ جاتے ہیں۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ منی ملکہ نے کیشن چوپڑا کو اچھی طرح نہیں۔ ایک مغرب زدہ آدمی کی شخصیت جاہل عورت کی روایتی ناقص العقلی کے پیش نظر اکثر اس کی سمجھ بوجھ سے بالاتر ہوتی ہے وہ خود عورت کی طرح ایک پُر اسرار ہستی بن کر رہ جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے مرد کی ان تین عام قسموں میں سے کسی فہرست میں بھی اس کو وثوق سے شامل نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) احمق (۲) اندھا (۳) وحشی۔

منی ملکہ نے اپنے مشیر اعلیٰ مدھو سودن کو بلایا۔ یہ دور کے رشتے سے اس کا چچیرا بھائی تھا۔ اور کیشن کمپنی کے تجارتی عملہ میں ایک اسامی پر تعینات تھا۔ قابلیت کی بنا پر نہیں بلکہ محض رشتہ داری کے ذریعہ وہ اس اسامی پر قابض تھا۔ حسنِ کارکردگی وجہ سے نہیں بلکہ رشتہ داری کی دھونس میں

تنخواہ سے بھی زیادہ رقم لے اڑتا تھا۔ منی نے تمام رام کہانی کہہ سنائی اور آخر میں پوچھا "کیا کروں نیک صلاح دو"۔

مدھو نے عقلمندانہ اور دور اندیشانہ انداز سے سر ہلایا اور کہا "میرا ماتھا ٹھنکتا ہے۔ اس معاملہ میں خیریت معلوم نہیں ہوتی"۔

دنیوی عقل کے ماروں کو ہر کام میں اندیشہ ہی رہا کرتا ہے اُن کو کسی معاملہ میں خیر نہیں دکھائی دیتی۔

"یعنی سمجھو شن کو روپیہ تو ملنے سے رہا۔ آخر میں تمہیں زیور سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے"۔

دنیوی معلات اور مرد کے متعلق جو منی ملکہ کے ذاتی خیالات تھے۔ اُن کی روشنی میں مدھو کے اخذ کردہ نتیجہ کا پہلا حصہ اغلب اور دوسرا یقینی معلوم ہوتا تھا۔ اطمینان اُس کے دل سے جاتا رہا۔ اولاد اس کے تھی ہی نہیں باقی رہا خاوند وہ کسی شمار و قطار میں نہ تھا۔ اس لیے اس کی تمام تر توجہ اپنے زیورات پر مرکوز تھی۔ انہی سے دل بستگی تھی۔ یہی اس کو بمنزلہ اولاد کے عزیز تھے۔ اولاد کو ماں سے چھین لیجیے پھر دیکھیے ماں تا کی ماری کا کیا حال ہوتا ہے یہی حال منی ملکہ کا تھا اس کا یہ خیال تھا کہ زیور خاوند کے خیالی منصوبوں کے صدقہ ہو جائے گا۔

"پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے"۔

"فوراً میکے چلی جاؤ۔ اور سارا زیور وہاں چھوڑ آؤ۔ چلتے پھرتے" مدھو نے کہا۔

اس صورت میں اس کی ہانڈی کو بھی بگھار لگتا ہے۔ اگر سارا نہیں تو کوئی نہ کوئی زیور اُس کے ہتھے چڑھنے کی بھی امید تھی۔ منی ملکہ نور" رضا مند ہو گئی۔ بڑھتی ہوئی تاریکی سے سکول ماسٹر پر بھی سکوت طاری ہو گیا تھا لیکن چند لمحوں کے بعد اس نے پھر سلسلہ بیان چھیڑا۔

(۳)

جھٹ پٹے کے وقت جب کہ جولائی کی گھٹائیں آسمان پر ڈیرا جمائے ہوئے تھیں۔ بارش موسلا دھار پڑ رہی تھی ایک کشتی نے ریتلی سیڑھیوں پر لنگر ڈالا۔ اگلی صبح گھٹا ٹوپ اندھیرے میں منی ملکہ آئی اور ایک موٹی چادر میں سر سے پاؤں تک لپٹی ہوئی کشتی پر سوار ہو گئی۔

مادھو جو رات سے اسی کشتی میں سویا ہوا تھا۔ اس کی آہٹ سے بیدار ہو گیا۔

"زیور کا صندوقچہ مجھے دے دو تاکہ حفاظت سے رکھ لوں"

"ابھی ٹھہرو جلدی کیا ہے؟ چلو تو سہی آگے دیکھا جائے گا"

کشتی کا لنگر اٹھا اور وہ تلاطم دریا کی موجوں سے دست و گریباں ہونے لگی۔ منی ملکہ نے سارا زیور ایک کر کے پہن لیا تھا۔ صندوقچہ میں بند کر کے لے جانا اُسے غیر محفوظ معلوم ہوتا تھا۔ مادھو ہکا بکا رہ گیا جب اس نے دیکھا کہ منی کے پاس صندوقچہ نہیں ہے اس کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اُس نے زیور کو اپنی جان سے لگا رکھا ہے۔

گو منی ملکہ نے کمی مجھوشن کر نہ سمجھا تھا لیکن مادھو کے کردار کا نہایت

صحیح اندازہ لگایا تھا۔

روانگی سے پہلے مادھو نے کبھوشن سے ایک معتمد منیم کو لکھ بھیجا تھا کہ میں ملکہ کے ساتھ اس کو میکے پہنچانے جا رہا ہوں۔ یہ منیم جہاندیدہ اور عمر آدمی تھا اور کبھی کبھوشن کے باپ کے زمانہ سے اسی کے ساتھ تھا اس کو روانگی سے سخت قلق اور اندیشہ ہوا۔ اس نے اپنے آقا کو فوراً لکھا۔ وفاداری اور خیر خواہی نے اُسے جرأت دلائی اور اُس نے اپنے خط میں اپنے آقا کو خوب کھری کھری سنائیں۔ خاوند کی غیرت اور دور اندیشی دونوں کے یہ منافی ہے کہ بیوی کو اس قدر مطلق العنان چھوڑ دیا جائے۔ منی ملکہ کے دلی اندیشہ کو کبھی کبھوشن سمجھ گیا۔ اُسے بے حد رنج ہوا۔ وہ اس معاملہ میں حرف شکایت کبھی زبان پر نہ لایا تھا۔ ذلت اور پریشانی اٹھائی لیکن اس نے منی ملکہ پر کوئی دباؤ ڈالنا گوارا نہ کیا۔ لیکن پھر بھی اسی قدر بدگمانی! سالہا سال سے وہ میری خلوت و جلوت کی رفیق ہے۔ تعجب ہے۔ اس نے مجھے اب تک ذرا بھی نہ سمجھا۔

اس موقعہ پر کوئی اور ہوتا تو غیظ و غضب میں نا معلوم کیا کر گزرتا لیکن کبھی کبھوشن خاموش تھا۔ اور اپنے رنج کے اظہار سے بھی منی ملکہ کو رنجیدہ کرنا گوارا نہ تھا۔

مرد کو چاہیئے کہ وہ جنگل کی آگ کی طرح ذرا ذرا سی بات پر بھڑک جائے جس طرح عورت جولائی کے ابر گریاں کی طرح بات بات پر آنسوؤں کی جھڑی لگا دیتی ہے۔ لیکن اب وہ اگلے سے دن کہاں؟

بھوشن نے منی ملکہ کو اس کی غیر حاضری میں بلا اطلاع روانگی کے متعلق کوئی تہدیدی خط نہ لکھا بلکہ یہ تہیہ کر لیا کہ مرتے دم تک اس کے زیور کا نام تک زبان پر نہ لاؤں گا۔ روپیہ کی فراہمی میں بھی بھوشن کامیاب ہو گیا۔ اس کی تجارتی راہیں کھل گئیں۔ دس دن کے بعد وہ اپنے گھر کو واپس چلا۔ اس وثوق کے ساتھ کہ زیورات میکے میں چھوڑ کر منی ملکہ گھر کو واپس آ گئی ہو گی۔

دس روز پہلے کا حقیر اور ناکام سوالی جب مستانہ شان سے گھر میں قدم رکھیگا اور بیوی کی نظر اس کامیابی سے دمکتے ہوئے چہرے پر پڑے گی۔ تو وہ اپنے انکار پر خجل ہو گی۔ اور اپنی نادانی پر پشیمانی کا اظہار کرے گی۔ ان خیالات میں مگن بھوشن سونے کے کمرے میں پہنچا لیکن دروازہ مقفل تھا۔ قفل تڑوا کر اندر داخل ہوا تو تجوری کے کواڑ کھلے پڑے تھے۔

صدمہ سے لڑکھڑا گیا" وفا اور محبت" اس وقت اس کے نزدیک بے معنی اور مہمل الفاظ تھے۔ طلائی پنجرہ جس کی ہر ایک سنہری تیلی کو اس نے اپنی جان اور آن کی قیمت ادا کر کے حاصل کیا تھا۔ لوٹ چکا تھا اور خالی پڑا تھا وہ اب دیوالیہ تھا۔ اور سوائے گرہائے اشک اور لعل گوں لخت ہائے دل کے اس کے پلے کچھ نہ تھا۔

منی ملکہ کو بلانے کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آیا۔ اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ جب چاہے آئے۔ آئے یا نہ آئے۔ لیکن بوڑھا منیم اس فیصلہ کے خلاف تھا۔ وہ اصرار کر رہا تھا۔ کم از کم اس کی خبر ضرور منگانی چاہیئے۔ اتنے توقف کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کے اصرار سے مجبور ہو کر منی ملکہ

کے میکے کر آدمی بھیجا گیا۔ لیکن وہ یہ روح فرسا خبر لایا کہ نہ یہاں منی ملکہ آئی ہے نہ مادھو۔

یہ سنا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ دریا کے پار آدمی دوڑائے گئے۔ تلاش اور جستجو کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہوا۔ لیکن پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ کشتی کس طرف کو گئی ہے۔ اور کون کشتی بان تھا۔

انتہائی مایوسی میں بھیکی بھوشن کلیجو مسوس کر بیٹھ رہا۔

(۴)

جنم اشٹمی کی شام تھی۔ بارش ہو رہی تھی۔ بھیکی بھوشن خواب گاہ میں اکیلا تھا۔ گاؤں میں ایک متنفس بھی باقی نہ تھا۔ جنم اشٹمی کے میلہ نے گاؤں کا گاؤں سونا کر دیا تھا۔ میلہ کی چہل پہل اور مہابھارت کے ناٹک کے شوق نے بچہ سے لے کر بوڑھے تک کو کھینچ لیا تھا۔ خواب گاہ کی کھڑکی کا ایک کواڑ بند تھا۔ بھیکی بھوشن دنیا اور مافیہا سے بے خبر بیٹھا تھا۔

شام کا جھٹ پٹا رات کی گہری تاریکی میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن اس بھیانک تاریکی۔ موسلا دھار بارش اور سرد ہوا کا اس کو احساس بھی نہ تھا دور کے گانے کی دلکش آواز سے اس کی سماعت بالکل بے خبر تھی۔

دیوار پر سرسوتی اور لکشمی کی تصویریں آویزاں تھیں فرش صاف تھا اور ہر چیز مناسب جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔

مسہری کے برابر ایک کھونٹی پر ایک خوش رنگ اور دلکش ساڑی لٹکی ہوئی تھی۔ سرہانے ایک چھوٹی سی میز پر پان کا بیڑا خود منی ملکہ کے

ہاتھ کا بنا ہوا رکھا رکھا سوکھ چکا تھا۔

متفرق اشیاء نہایت سلیقہ سے اپنی اپنی جگہ رکھی تھیں۔ ایک طاق میں منی ملکہ کا پسندیدہ لیمپ رکھا تھا۔ جس کو وہ اپنے ہاتھ سے روشن کیا کرتی تھی۔ اور جو اس کی آخری رخصت کی یاد دلا رہا تھا۔ منی کی یاد میں ان تمام اشیاء کی خاص گریہ وزاری اس کمرہ کو ایک حسرت ناک ماتم کدہ بنائے ہوئے تھی۔ بھینی بھوشن کا دل بے اختیار کہہ رہا تھا۔

"پیاری منی آؤ اور اپنے جانفزا حسن سے ان سب میں جان ڈال دو وہ کہیں آدھی رات کے قریب جا کر بوندوں کی تڑتڑ تھمی۔ لیکن بھینی بھوشن اسی خیال میں محو بیٹھا تھا۔

شب دیجور کی لامحدود تاریک فضا پر موت کی قلمرو کا سکہ چل رہا تھا۔ بھینی بھوشن کی غمزدہ روح کی زنجور آواز اتنی دردناک تھی کہ اگر موت کی نیند سونے والی منی ملکہ بھی سن پائے تو ایک مرتبہ آنکھیں کھول دے اور اپنے طلائی زیورات پہنے ہوئے اس فضائے تاریک میں ایسی نمودار ہو۔ جیسے کسوٹی کے سخت پتھر پر خفیف سی سنہری دھاری۔

(۱۱)

اچانک بھینی بھوشن کے کان میں قدموں کی سی آہٹ سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دریا کے کنارہ سے وہ اس گھر کی طرف واپس آ رہی ہے۔ دریا کی تاریک موجیں شب کی تاریکی میں معلوم نہ ہوتی تھیں۔ امید کی خوشی نے اُسے زندہ کر دیا۔ اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ اس

نے پردۂ تاریکی کو چاک کرنا چاہا مگر بے سود۔ جتنا زیادہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا۔ تاریکی کے پردے زیادہ گہرے ہوتے جاتے تھے۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت اس مہیب تاریکی میں انسانی مداخلت کے خلاف احتجاج کر رہی ہے۔ آواز قریب سے قریب تر آگئی۔ اور سیڑھیوں پر چڑھی اور سامنے دروازہ پر آکر ٹھہر گئی۔ جو مقفل تھا۔ دربان بھی میلہ پر گیا ہوا تھا۔ دروازہ پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔ ایسی کہ زیور والا زنانہ ہاتھ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ بھینی بھوشن ضبط نہ کر سکا۔ زینہ سے اتر کر برآمدہ سے ہوتا ہوا دروازہ پر پہنچا۔ قفل باہر سے لگا ہوا تھا۔ انتہائی طاقت سے اس نے دروازہ ہلایا۔ شور سے اس کا طلسم خیال ٹوٹا تو وہاں کچھ نہ تھا۔

وہ پسینہ میں شرابور تھا۔ ہاتھ پاؤں سرد پڑے ہوئے تھے۔ اس کا دل ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی آخری روشنی کی طرح میل بجھنے کو تیار تھا۔ بارش کی تڑتڑ کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

بھینی بھوشن کو یہ "حقیقت" ہرگز فراموش نہ ہوئی تھی۔ اس کو افسوس تھا۔ کہ اس کی ناکام تمنائیں پوری ہوتے ہوتے رہ گئیں۔

(٦)

اگلی رات کو پھر ناٹک ہونے والا تھا۔ نوکر نے اجازت چاہی۔ تو تاکید کر دی کہ باہر کا دروازہ کھلا رہے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کئی طرح کے آدمی باہر سے میلہ پر آئے ہوئے ہیں۔ واردات کا اندیشہ ہے" نوکر نے کہا۔

"نہیں تم دروازہ ضرور کھلا رکھو"

"تو پھر میں میلہ نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں تم ضرور جاؤ۔"

نوکر حیران تھا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟

جب زمانہ پر افسونِ شب طاری ہوا۔ تو بھی بھوشن پھر اس کھڑکی میں آ بیٹھا۔ آسمان پر بہت گہرا ابر چھایا تھا۔ گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی کہ جل تھل ایک کر دے۔ ہر طرف سکوت کا عالم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری فضا عالم خاموشی میں کسی خوشگوار صدا کے لیے گوش بر آواز ہے مینڈکوں کی مسلسل ٹرٹر اور دیہاتی سوانگیوں کی تھرتھراتی ہوئی آواز بھی اس سکوت میں مخل نہ معلوم ہوتی تھی۔

آدھی رات کے قریب پھر تمام شور سکوتِ شام ہی سونے لگے اور رات نے اپنے سیاہ کپڑوں پر ایک اور سیاہ قرغل پہن لیا۔ گزشتہ شب کی طرح بھی بھوشن کو پھر وہی آواز سنائی دی۔ اس نے دریا کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ مبادا کوئی بے اختیارانہ حرکت قبل از وقت اس کی آرزوؤں کا خون کر دے۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا گویا کسی نے لکڑی کا بت بنا کر سریشم سے کرسی پر چپکا دیا ہو۔

قدموں کی دبی آواز اشنان گھاٹ کی سیڑھیوں کی طرف سے آ کر صدر دروازہ میں داخل ہوئی۔ پھر دار زینہ کی سیڑھیوں پر چڑھ کر اندرونی کمرہ کی طرف بڑھی۔ موجوں کے تلاطم میں آپ نے کسی کو دیکھا ہوگا۔ اسی طرح بھی بھوشن

۱۵۶

کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ دم گھٹنے لگا۔ وہ آواز برآمدہ سے گزر کر خوابگاہ کی طرف آئی۔ اور عین دروازہ پر آکر ٹھہر گئی۔ اب صرف دروازہ میں داخل ہونا باقی تھا۔

کیشی بھوشن کی تمنائیں مچل اٹھیں۔ دامنِ ضبط ہاتھ سے بالکل جاتا رہا۔ وہ بے اختیار کرسی سے اچھل پڑا۔ ایک دردناک چیخ "منی" اس دل سے نکلی۔ لیکن افسوس کہ اس کے بعد مینڈکوں کی آواز اور بارش کی بڑی بڑی بوندوں کی پڑپڑ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

۱۵۷

اگلے دن میلہ چھٹنے لگا۔ دکانیں اٹھنی شروع ہوگئیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہونے شروع ہوئے۔ میلہ کی رونق ختم ہوگئی۔

کیشی بھوشن نے دن میں برت رکھا اور حکم دے دیا کہ آج رات کو گھر میں کوئی متنفس نہ رہے۔ نوکروں کو خیال تھا کہ ہمارے آقا آج کسی

خاص منتر کا جاپ کریں گے۔

آج شام کو کہیں کہیں آسمان کی ٹکڑیوں پر مطلع صاف تھا۔ بارش سے دھلی ہوئی فضا میں ستارے چمکنے لگے تھے۔ پورنماشی کا چاند نمودار تھا۔ ہوا بھی ہلکی ہلکی چل رہی تھی۔ میلہ کے تماشائی اپنی تکان اتار رہے تھے۔ اور غفلت میں پڑے سوتے تھے۔ دریا پر کوئی کشتی دکھائی نہ دیتی تھی۔

بھنی بھوشن اس کھڑکی میں آبیٹھا۔ اور تکیہ سے سر لگا کر آسمان کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اس کو اس وقت وہ زمانہ یاد آیا جب وہ کالج میں زیر تعلیم تھا۔ شام کو صحن کے لان پر لیٹ کر اپنے بازو پر سر رکھ کر جھلملاتے ستاروں کو دیکھ کر کسی ایک حسین تصور میں کھو جایا کرتا تھا۔ ان دنوں کی عارضی جدائی ملاقات کی امید وہ اپنے آغوش میں لیے بڑی خوش آئند معلوم ہوا کرتی تھی۔ لیکن وہ سب کچھ اب "خواب" معلوم ہوتا تھا۔

ستارے آسمان سے اوجھل ہونے لگے۔ تاریکی نے دائیں بائیں اور نیچے اوپر سب سے پردے ڈالنے شروع کئے۔ اور یہ پردے آنکھ کے پپوٹوں کی طرح مل گئے۔ دنیا محو خواب ہوگئی۔

لیکن آج بھنی بھوشن پر ایک خاص کیفیت طاری تھی وہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ اس کی امیدیں بر آنے کا وقت قریب ہے۔

گزشتہ راتوں کی طرح آہٹ پھر اشنان گھاٹ کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ بھنی بھوشن نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور خیالات میں مستغرق ہوگیا۔ آواز

کھلے ہوئے دروازے سے داخل ہو کر تمام مکان میں ہوتی ہوئی خوابگاہ کے دروازہ پر آ کر گم ہو گئی۔ بھبھی بھوشن کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ لیکن وہ تہیہ کر چکا تھا۔ کہ آخر تک آنکھیں نہ کھولوں گا۔ آواز کمرہ میں داخل ہوئی۔ کھونٹی پر کی ساری اور طاق کے لیمپ کھلے ہوئے پاندان اور دیگر اشیاء کے پاس تھوڑی تھوڑی دیر ٹھہری۔ اور آخر میں بھبھی بھوشن کی کرسی کی طرف بڑھتی ......!

اب بھبھی بھوشن نے آنکھیں کھول دیں۔ ہلکی ہلکی چاندنی کھڑکی سے آ رہی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک ڈھانچہ ایک پنجر کھڑا تھا۔ اس کی ہر ہر پور پر جھول تھا۔ کلائیوں میں کڑے گلے میں مالا غرضیکہ ہر جوڑ زیور کا زیورات سے دمک رہا تھا۔ تمام زیورات ڈھیلے ہونے کی وجہ سے نکلے پڑتے تھے۔ آنکھیں ویسی ہی بڑی بڑی اور روشن مگر جذبۂ محبت سے عاری تھیں اٹھارہ سال قبل شادی کی رات کو شہنائیوں کی سریلی صداؤں میں انہی موہنی آنکھوں سے منی ملکہ نے بھبھی بھوشن کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ آج وہی آنکھیں برسات کی بھیگی چاندنی میں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

پنجر نے دائیں ہاتھ سے اشارہ کیا۔ بھبھی بھوشن خود بخود چل پڑنے والی کل کی طرح اٹھا۔ اور پنجر کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ہر قدم پر اس کی ہڈیاں چٹخ رہی تھیں۔ زیور بج رہے تھے وہ برآمدہ سے گزرے۔ سیڑھیوں سے نیچے اترے اور اسی راستہ پر ہو لئے جو اشنان گھاٹ کو جاتا تھا۔ تاریکی میں جگنو کبھی کبھی چمک اٹھتے تھے۔ مدھم چاندنی درختوں کے

گئی ان پتوں سے نکلنے کے لیے کشمکش کر رہی تھی۔

یہ دونوں دریا کے کنارے پہنچے۔ ہنجر نے سیڑھیوں سے اترنا شروع کیا۔ سطح آب پر چاندنی کا عکس دریا کی لہروں سے کھیل رہا تھا۔ ہنجر دریا میں کود پڑا۔ اس کے پیچھے پھنی کا قدم بھی دریا میں گیا۔ اس کا طلسم خیال ٹوٹا، تو وہاں کوئی نہ تھا۔ صرف درختوں کی ایک قطار پاسبانی کر رہی تھی۔

اب پھنی بھوشن کے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ پھنی بھوشن بھی ایک اچھا تیراک تھا۔ لیکن اس کے ہاتھ پاؤں بس میں نہ تھے اگلے لمحہ میں اجل کے اتھاہ دریا کی تہہ میں جا چکا تھا۔

اس دردناک انجام پر سکول ماسٹر نے داستان کو ختم کیا۔ اس کے اختتام پر ہمیں پھر ایک مرتبہ خاموش فضا کا احساس ہوا۔ میں بھی خاموش تھا۔ اندھیرے میں میرے چہرے سے بھی میرے خیالات کا مطالعہ وہ نہ کر سکتا تھا۔

"کیا آپ اس کو افسانہ کہتے ہیں؟" اس نے مشتبہ انداز میں پوچھا۔

"اور آپ؟" میں نے جواب میں دریافت کیا۔

"نہیں میں تو اسے حقیقت نہیں سمجھتا۔ اول تو اس وجہ سے کہ قدرت ناول نگاری اور افسانہ نویسی سے بالاتر ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میں ہی پھنی بھوشن ہوں!" میں نے قطع کلام کر کے کہا۔

سکول ماسٹر کچھ زیادہ پریشان نہ تھا۔

"لیکن آپ کی بیوی کا نام ؟" اس نے پوچھا۔
"نرتیا گانی۔"

ختم شد

کتبہ :۔ محمد تصنیف حسین پورنیوی